کہکشاں

حصّہ اوّل

گیارہویں جماعت کے لئے

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

محکمۂ تعلیم، حکومت بہار سے منظور

● صوبائی کونسل برائے تعلیمی تحقیق و تربیت (SCERT) بہار، پٹنہ کے تعاون سے پورے صوبۂ بہار کے لئے

© بہار اسٹیٹ ٹکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن، لمیٹڈ، پٹنہ

Re-Print	2010	50,000
Re-Print	2015	20,000

قیمت: Rs. 61.00

﴿ شائع کردہ ﴾

بہار اسٹیٹ ٹکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن، لمیٹڈ

پاٹھیہ پستک بھون، بدھ مارگ، پٹنہ۔ 800001

مطبوعہ: نیشنل پرنٹنگ ورکس، گن گن سنگھ لین، پٹنہ۔۶

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

کہکشاں

اردو کی درسی کتاب گیارھویں جماعت کے لیے

حصّہ اوّل

Urdu Textbook for Class XI

Part - I

بہار اسٹیٹ ٹکسٹ بک پبلیشنگ کارپوریشن لمیٹیڈ، پٹنہ

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

اپنی بات

اس بار بہار ٹکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن کی جانب سے اسٹیٹ کاؤنسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، بہار کی جانب سے تیار شدہ زبان وادب کی بالکل نئی کتابیں شائع کی جارہی ہیں۔ زندگی جتنی تیزی سے بدل رہی ہے، اس کی وجہ سے ہمارے نظامِ تعلیم میں نئے طریقے سے نشانات بھی مقرر کیے جارہے ہیں۔ اپنے نصاب کی جدید کاری اور نئی نسل کی ضرورت کے لیے بہترین درسی کتابیں تیار کرنا ہمارا قومی فریضہ ہے۔ ہمیں اس بات پر بھی نظر رکھنی ہے کہ قومی سطح پر مختلف مضامین کی کتابوں کا معیار کیا ہے اور کیا ہم اُن کے برابر یا اُن سے بہتر اپنی کتابیں تیار کر پارہے ہیں؟

موجودہ کتاب کی تیاری میں ہمارے ماہرین نے انھی اصولوں کا خیال رکھا ہے۔ جب تک ہمارا نصاب تعلیم معیاری نہ ہوگا اور اس کے مطابق مناسب درسی کتاب تیار نہ کردی جائے، اس وقت تک ہم اپنے ہونہار طالب علموں کی ضرورتوں کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتے۔ یہ کتاب ایک نئے جوش اور جذبے کے ساتھ تیار کی گئی ہے جس میں ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ طلبہ کو اسباق کے سمجھنے میں زیادہ سے زیادہ سہولت ملے؛ اساتذہ کو تدریس کے دوران درسی کتاب کے ذریعے بھرپور تعاون مل سکے اور ہمارا طالب علم چلتے پھرتے ہی زندگی کی بڑی بڑی باتیں اور علم وادب کے گہرے رموز سیکھتا جائے۔ اس کے لیے اسباق کے متن پر بھرپور تجزیاتی مشقیں شامل کی گئی ہیں تاکہ طالب علم کسی پریشانی میں نہیں پڑے۔

بہار ٹکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن کی جانب سے میں ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔ کے ڈائرکٹر، بہار اسکول اگزامینیشن بورڈ (سینیر سکنڈری) کے ڈائرکٹر (اکادمک) اور نصاب اور درسی کتاب کمیٹی کے اکادمک کوآرڈینیٹر کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی توجہ سے ماہرین کا تعاون حاصل کیا جاسکا۔ میں اورینٹل لینگویجز کمیٹی کے چیرمین کا بھی شکرگزار ہوں جنھوں نے اپنی نگرانی میں اردو، فارسی اور عربی کی درسی کتابیں تیار کرائیں۔

یہ کتابیں آیندہ اشاعتوں میں مزید رنگ وروغن کے ساتھ شائع کی جاسکیں گی لیکن موجودہ اشاعت میں سادگی میں پُرکاری ملاحظہ کرنے کے لیے میں اربابِ حل وعقد کو دعوت دینا چاہوں گا۔ کتاب میں کوئی فروگذاشت ہو تو اس کی فوراً اطلاع بہم پہنچائیں تاکہ بروقت اصلاح کرکے آیندہ اشاعتوں کو غلطیوں سے پاک کیا جاسکے۔

ولیپ کمار I.T.S.

مینیجنگ ڈائرکٹر

بہار اسٹیٹ ٹکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن لمیٹڈ

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

گزارش

گذشتہ ایک برس میں اسٹیٹ کاؤنسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔)، بہار نے اسکولی تعلیم کے لیے مبسوط نصاب بنانے کی جو سرگرمیاں جاری رکھیں، انھی کا یہ کتاب ثمرہ ہے۔ ہمارے ادارے نے پہلی بار بہار کے نصابِ تعلیم اور درسی کتاب کے لیے تمام تر ذمے داری اپنے سر لے رکھی ہے۔ اردو، فارسی اور عربی کے سلسلے سے تو آج سے پہلے ہم کوئی موثر کام نہیں انجام دے پائے تھے۔ قومی سطح پر بڑے تعلیمی اداروں میں جس انداز سے کتابیں تیار کرانے کا سلسلہ رہتا ہے، ہم نے بھی انھی خطوط پر آگے بڑھنے کا ارادہ کیا۔ نصابِ تعلیم اور درسی کتاب سے متعلق مختلف ورک شاپ اور مذاکروں کے ذریعے درسی کتاب تیار کرنے کے لیے مختلف مضامین کے باصلاحیت، تجربہ کار اور محنتی لوگوں کی ایک ٹیم بنتی چلی گئی۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ ہمارا تعلیمی تصوّر، نصاب اور درسی کتاب میں ڈھل کر عوام کے سامنے آیا۔

گیارھویں کے لیے اردو زبان وادب کی جو درسی کتاب تیار ہوئی ہے، اُس میں جن مرحومین کی تخلیقات شامل ہیں، اُن کے وارثین کے ہم شکر گزار ہیں۔ سیّد محمد محسن، احمد جمال پاشا، کنھیا لال کپور، رضا نقوی واہی، اختر الایمان، فراق گورکھ پوری اور جمیل مظہری کے وارثین کا ہم بالخصوص شکریہ ادا کرتے ہیں۔ تکشی شیو شنکر پلّے کے وارثین اور اُن کے پبلشر بھارتیہ گیان پیٹھ کا بھی شکریہ ہم پر واجب ہے۔ فیض احمد فیض، امتیاز علی تاج اور ناصر کاظمی کی تخلیقات بھی ہماری کتاب کی زینت بنیں، اُن کے وارثین کا شکریہ بھی لازم ہے۔ محترمہ قرۃ العین حیدر، محترمہ ساجدہ زیدی، جناب سیّد حامد، جناب ظفر گورکھ پوری، جناب مظہر امام، جناب طارق چھتاری، جناب غضنفر، جناب آلوک دھنوا اور محترمہ غزال ضیغم کی تخلیقات کی شمولیت سے ہماری کتاب کا معیار بلند ہوا۔ اُن کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کے موقعے سے ہم اردو کمیٹی کے تمام اراکین، کوآرڈینیٹر جناب ظفر کمالی، معاون کوآرڈینیٹر محترمہ ترنّم جہاں اور چیرمین، اورینٹل لینگویجز جناب صفدر امام قادری کا خاص طور پر شکر گزار ہیں۔ انھوں نے نہایت مستعدی کے ساتھ اس ذمے داری کو بہ حُسن وخوبی انجام دیا۔ کتاب کی تزئین اور تصحیح کے کام میں بھی ان لوگوں

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

نے متعلقہ افراد سے تعاون لے کر ہماری پریشانیاں کم کر دیں۔ ہمیں اطمینان ہے کہ یہ کتاب بہار کے طلبہ کے لیے نہ صرف مفید ہوگی بلکہ نئے تعلیمی ماحول کی تعمیر میں اس سے بھرپور مدد بھی ملے گی۔ بچّہ زیادہ سے زیادہ سیکھتا جائے، اس سمت میں اس کتاب کے مشتملات مینارۂ نور بن سکیں، یہی میری تمنا ہے۔ بہار ٹکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن کے اہل کار بالخصوص اُس کے ایم۔ڈی۔ جناب فراق احمد کا بھی شکریہ ادا کیا جاتا ہے جن کی کوششوں سے ہماری نصابی کتاب بَروقت چھپ کر منظرِ عام پر آسکی۔

آیندہ اشاعتوں میں یہ کتاب اور زیادہ کارآمد ہو سکے، اس کے لیے ضروری ہے کہ پڑھنے والے اپنی مفید رائے ہم تک بھجوانے کی زحمت اٹھائیں۔ طلبہ اور اساتذہ سے بھی ہماری گزارش ہوگی کہ اس کتاب کے بارے میں اپنی واضح صلاح دیں۔ اُن کا پیشگی شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

اِندو مَولی ترپاٹھی
ڈائرکٹر
ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔، بہار، پٹنہ

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

کمیٹی برائے درسی کتاب (اردو)

زیرِ سرپرستی

جناب اندو مولی ترپاٹھی، ڈائرکٹر، ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی، بہار
جناب رگھونش کمار، ڈائرکٹر (اکادمک)، بہار اسکول اگزامنیشن بورڈ، (سینیر سکنڈری)، پٹنہ

چیرمین، اورینٹل لینگویجز گروپ

صفدر امام قادری، صدر شعبۂ اردو، کالج آف کامرس، پٹنہ

کوآرڈینیٹر

ظفر کمالی، شعبۂ فارسی، زیڈ۔اے۔اسلامیہ کالج، سیوان

معاون کوآرڈینیٹر

ترنم جہاں، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، مگدھ یونی ورسٹی، بودھ گیا

اراکین

رضوان احمد خاں، ریٹائرڈ استاد، بریگھ کالج، بریگھ (ٹی۔ایم۔بھاگل پور یونی ورسٹی، بھاگل پور)
جمشید قمر، سابق صدر شعبۂ اردو، رانچی کالج، رانچی
محمد علی الیاس، ہیڈ ماسٹر، کھردیوا اسکول، چنپٹیا، مغربی چمپارن
مشتاق احمد، شعبۂ اردو، ملت کالج، دربھنگہ
واحد نظیر، استاد، شہید راجندر پرساد سنگھ گورنمنٹ ہائی اسکول، گردنی باغ، پٹنہ
نسیم احمد نسیم، سینیر ریسرچ فیلو، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ
محمد زاہد الحق، شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی
عابدہ پروین، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، پٹنہ یونی ورسٹی، پٹنہ
ممتا بھارتی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، حیدرآباد (پٹنہ سنٹر)

اراکین صلاح کار کمیٹی، بہار اسکول اگزامنیشن بورڈ

پروفیسر وہاب اشرفی، سابق چیرمین، بہار یونی ورسٹی سروس کمیشن اور بہار انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کاؤنسل، پٹنہ
پروفیسر فاروق احمد صدیقی، صدر شعبۂ اردو، بی۔آر۔اے۔بہار یونی ورسٹی، مظفر پور
پروفیسر فصیح الزماں، صدر شعبۂ اردو، مگدھ یونی ورسٹی، بودھ گیا

اکادمک کنوینر

جناب گیان دیو منی ترپاٹھی، کمیٹی برائے نصاب اور درسی کتاب
اڈیشنل ڈائرکٹر، اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل مینجمنٹ (سیمیٹ)

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

چند الفاظ نئے نصاب اور درسی کتاب کے بارے میں

2005ء میں این۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔، نئی دہلی نے ملک کے ممتاز ماہرینِ تعلیم اور دانش وروں کے تعاون سے قومی درسیات کا خاکہ NCF-2005 شائع کیا۔ پورے ملک میں اس کے ابتدائی خاکے سے جو مباحث قائم ہوئے، انھی کا یہ اثر تھا کہ ملک کے طول وعرض میں مروّجہ تعلیمی نظام میں خاطر خواہ تبدیلی لانے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ بہار اُن صوبوں میں شامل رہا جس نے نہ صرف یہ کہ قومی درسیات کے سلسلے میں اپنے واضح نقطۂ نظر کو پیش کیا بلکہ انھی مباحث کے دوران یہ تاثر بھی اُبھرا کہ قومی سطح پر طے شدہ درسیات کے اس خاکے کو صوبۂ بہار کے مخصوص تناظر میں سو فی صد کارگر تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی بیچ یہ بات بھی سامنے آئی کہ مخصوص حالات کے پیشِ نظر بہار کی درسیات کا خاکا بھی علاحدہ طور پر تیار کیا جانا چاہیے۔ Bihar Curriculum Framework (BCF- 2006) صوبۂ بہار کے تعلیمی نظام کو ایک نئے تصور، نقطۂ نظر اور لائحۂ عمل سے ہم آشنا کرانے کا شاید وسیلہ ثابت ہو۔

درسیات، نصاب اور درسی کتاب کے آپسی رشتوں کے بارے میں ہمارے صوبے میں زیادہ غور وفکر کی روایت نہیں تھی۔ خاکۂ نصاب تیار کر کے، کتابیں بنا لینے یا قومی سطح پر موجود درسی کتاب کو من وعن یا جزوی تحریف کے ساتھ استعمال میں لانے کا انداز گذشتہ دو دہائیوں سے قائم رہا ہے لیکن اس بار پرانے طرزِ عمل کو چھوڑتے ہوئے نئے نشانات مقرر کیے گئے۔ این۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔ کے NCF-2005 کی روشنی میں جس گفتگو کا آغاز ہوا، اُسے BCF-2006 اور این۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔ کے نصاب اور بہار کے گذشتہ نصاب اور بہار ٹکسٹ بک اور این۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔ کی کتابوں کا موازنہ کیا گیا اور یہ جانچنے کی کوشش کی گئی کہ نصاب کا کتنا حصہ درسی کتاب میں شامل ہو سکا اور کتنا چھوٹ گیا۔ اس طرح تقریباً ایک برس کی میرا تھن سرگرمی کے بعد ہم بہار کے لیے ایک نیا نصابِ تعلیم تیار کرنے میں کامیاب ہوئے۔

تعلیم سے متعلق دنیا میں جو نئے سوالات یا چیلنجز ہمارے سامنے ہیں، اُن کو دیوار پر لکھی عبارت کی طرح ہم نے سب سے پہلے توجہ کا مرکز بنایا۔ درجۂ اوّل سے لے کر درجۂ دوازدہم تک ہمارا طالب علم کس طرح زینہ بہ زینہ اگلی منزلوں کی طرف بڑھتا جائے گا، اس کا واضح خاکا نصاب تیار کرتے ہوئے ہماری نگاہ میں تھا۔ ہر سطح سے آگے بڑھتے ہوئے بچّہ کیا سیکھتا جائے گا جس سے اُسے ایک ذمّے دار اور موثر شہری بننے میں مدد ملے، اس کا بھی ہم نے دھیان رکھا۔ بچّوں پر نظامِ تعلیم اور کتابوں کا غیر ضروری بوجھ نہ لد جائے، اس کے تئیں بھی ہم نے غفلت نہیں برتی۔ ان تمام امور پر بیدار رہتے ہوئے ہم نے اپنا نصاب تیار کیا۔

جہاں تک زبان وادب کی تعلیم کا سوال ہے، اس کی اہمیت کچھ زیادہ ہی ہے۔ مادری زبان تو وہ پونجی ہے جس کے بغیر بچّے کا وجود تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کئی دوسری زبانیں اور بولیاں بہار جیسے کثیر لسانی معاشرے میں پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ ایک بچّے

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

کو اُن تمام زبانوں اور بولیوں میں سے مقدور بھر سیکھنے کی ضرورت ہوگی۔ زبانیں ماحول سے بچّے کے اندر داخل ہوتی ہیں اور نصابی کتاب تک پہنچنے سے پہلے ہی سیکڑوں الفاظ اور جملوں سے وہ واقف ہو چکا ہوتا ہے۔ زبانوں کی مدد سے ہی وہ دوسرے مضامین کی تعلیم بھی حاصل کرتا ہے۔ NCF-2005 نے خاص طور پر کثیر لسانی معاشرے کی پہچان کی اور ہندستان کی تہذیبی اور ثقافتی طاقت کو نصاب کا حصّہ بنانے کی وکالت کی۔ صوبۂ بہار بھی بولیوں اور زبانوں کی اس زرخیزی کی بہترین تجربہ گاہ ہے جس کی وجہ سے نصابِ تعلیم میں مختلف علاقائی، قومی اور بین الاقوامی زبانوں سے طلبہ کو روشناس کرانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس طرح ہماری یہ کوشش رہی کہ یہ نصاب بہار کی مخصوص ضرورتوں کی تکمیل کرتے ہوئے نہ صرف قومی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو بلکہ اس کے دروازے اور کھڑکیاں بین الاقوامی فضیلوں کی طرف بھی کھلیں۔

اردو کے ساتھ فارسی اور عربی کے نصابِ تعلیم کی ہماری مشترکہ ذمّے داری تھی۔ ہندستانی معاشرے کے لیے اردو ایک زندہ اور روزکام آنے والی زبان ہے جسے مادری زبان/ پہلی زبان کے طور پر لاکھوں طالب علم اپناتے ہیں۔ فارسی اور عربی زبانیں ہر چند ہمارے معاشرے میں دوسری، تیسری اور چوتھی زبانوں کا درجہ رکھتی ہیں پھر بھی اُن کی شدید ضرورت کے دو واضح اسباب ہیں۔ دونوں زبانیں کلاسیکی اہمیت کی حامل ہیں اور اُن کا وقیع ادبی سرمایہ نہایت کارآمد ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ دونوں زبانیں عالمی سطح پر بہترین معاشی وسائل فراہم کرتی ہیں۔ کلاسیکی ہونے کے باوجود یہ زبانیں زندہ اور متحرک ہیں۔ اس لیے ان دونوں زبانوں کے نصابِ تعلیم اور درسی کتاب تیار کرتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ چھٹی جماعت سے انھیں پڑھنے کے باوجود بارھویں درجے تک پہنچ کر بچّہ اتنی صلاحیت پیدا کرلے کہ وہ ان زبانوں میں کاروباری ضرورتیں پوری کر سکے۔

اردو مادری زبان ہے اور طلبہ کو درجۂ اوّل سے اس کا مطالعہ کرنا ہے، اس لیے اس زبان کے نصاب کی تیاری میں دوسرے اصول کارفرما رہے۔ مادری زبان کے سیکھنے کے وسائل نصابی کتاب اور کلاس روم کے علاوہ کئی اور بھی ہیں۔ دوسری زبانوں کے مقابلے اس کے سیکھنے کی رفتار تیز تر ہوگی۔ بچّہ نصابی کتاب کے باہر سے بھی بہت کچھ نیا سیکھتا جاتا ہے۔ اس لیے مادری زبان کے نصاب کی تیاری میں ہمارے سامنے یہ چنوتی بھی ہوتی ہے کہ آخر پورے سال تواتر کے ساتھ اس نصاب کو کیسے پڑھایا جائے؟

پہلی سے بارھویں تک نصاب بنانے کے بعد پہلے مرحلے میں ہمیں گیارھویں جماعت کی درسی کتاب تیار کرنے کی ذمّے داری ملی۔ گیارھویں درجے میں ایک بالغ نظر طالب علم ہمارے سامنے رہتا ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ گیارھویں اور بارھویں جماعتیں اسکولی زندگی کا ایسا مقام ہیں جس کے بعد طالب علم کی زندگی کے تعلیمی خاکے میں واضح تبدیلیاں آئیں گی۔ ممکن ہے، بی۔ اے۔ کے درجات میں وہ زبان وادب کا ہو کر رہ جائے یا ٹھیک اس کے برعکس ایسے مضامین کی طرف بڑھ جائے جہاں زبان وادب کی کوئی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ دونوں صورتوں میں ہمارا مطمحِ نظر یہ رہا کہ طالب علم کی ادبی ضرورتوں کو ابتدائی طور پر اوّلیت دی جائے۔ اسے اس قدر ادب پڑھا دیا جائے کہ اگر اس نے ادب کو چھوڑ کر دوسرے مضامین کو اپنایا تب بھی اس کی تمام زندگی میں ادب کی روشنی موجود رہے یا اگر آیندہ وہ ادب کا ہی طالب علم ہونا چاہے تب بھی اس

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

کی بنیاد اتنی ٹھوس اور مستحکم ہو جس سے وہ اعلا جماعتوں میں ادب کا بہترین طالب علم بن سکے۔ انھی باتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے گیارھویں اور بارھویں جماعتوں میں ہم نے ایک ایک درسی کتاب کے علاوہ تاریخ ادب اور قواعد کی ایک ایک کتاب مشترکہ طور پر شامل کی ہے۔ اُن سب کے مطالعے کے بعد ایک طالب علم سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ابتدائی طور پر زبان وادب کا بہترین طالب علم ثابت ہوگا۔

ہماری کتاب، کمیٹی کے تمام ارکان کی مسلسل محنتوں کا ثمرہ ہے۔ اس موقعے سے ہم اُن تمام افراد کے شکر گزار ہیں۔ محکمۂ تعلیم کے سکریٹری ڈاکٹر مدن موہن جھا، جناب کے۔ پی۔ سنگھ، ڈائرکٹر، ثانوی تعلیم، جناب اِندو مَولی ترپاٹھی، ڈائرکٹر ایس۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی۔، بہار اسکول اکزامینیشن بورڈ کے سکریٹری جناب انوپ کمار سنہا کے ہم خاص طور پر شکر گزار ہیں جن کی سرپرستی میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ ایس۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی۔ بہار کی نصاب اور درسی کتاب کمیٹی کے اکادمک کنوینر جناب گیان دیو منی ترپاٹھی گذشتہ ایک برس میں کمیٹی کے ارکان کے ساتھ علمی اور تنظیمی امور پر جس فیاضانہ طریقے سے مسلسل تعاون فرماتے رہے، اس کے لیے شکریے کے الفاظ رسمی معلوم ہو رہے ہیں۔ ہمیں یہ اعتراف کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ اُن کی اکادمک رہنمائی کے بغیر یہ کتاب پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

صلاح کار کمیٹی کے معزز اراکین کا شکریہ بھی ہم پر واجب ہے جنھوں نے ہماری کتاب کو توجہ کے ساتھ ملاحظہ کیا اور اپنے مفید مشوروں سے اسے زیادہ کارآمد بنایا۔ گورنمنٹ اردو لائبریری کے لائبریرین جناب حسن احمد اور خدا بخش لائبریری کے اہل کاروں کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا جاتا ہے جنھوں نے اس کتاب کی تیاری کے مرحلے میں فیاضی کے ساتھ ضروری کتابیں مہیا کرائیں۔ جناب روی راج نے اردو کی کتاب میں متن سے متعلق اسکیچز تیار کیے اور جناب وصی احمد نے شعرا وادبا کی تصویریں بنائیں۔ ان سے کتاب کے حُسن میں اضافہ ہوا ہے۔ دونوں کا شکریہ لازم ہے۔ کمپیوٹر کمپوزنگ کے مرحلے میں جناب محمد ذوالفقار حیدری، محمد سلیم احمد (دی پرنٹ لائن)، محمد معظم (ایم۔ ایم۔ کمپیوٹرس)، جمیل احمد اور شجاع الزماں ننھے (آئڈیل کمپیوٹرس) نے نہایت مستعدی سے ہماری کتابیں تیار کیں۔ جاوید اقبال، منی بھوشن کمار، محمد امین، محمد طیب انصاری، ضیاء الحق اور علینہ علی ملک نے پروف ریڈنگ اور کاپی ایڈیٹنگ میں دستِ تعاون بڑھایا، ہم اُن کے شکر گزار ہیں۔ اسکول اور کالج کے جن اساتذہ نے ہماری ٹیم میں کام کیا، ہم اُن کے پرنسپل صاحبان کے بھی شکر گزار ہیں جنھوں نے اس کام کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے انھیں فراخ دلی سے چھٹیاں دیں۔

اساتذہ کرام، سرپرست حضرات اور طلبہ سے ہماری گزارش ہوگی کہ اس درسی کتاب کے مشمولات کے بارے میں ہمیں اپنی رائے سے واقف کرائیں تاکہ آیندہ اشاعتوں میں اسے مزید کارآمد، سہل اور دل چسپ بنایا جاسکے۔

ہماری دعا اور تمنا ہے کہ یہ کتاب طلبہ کی زندگی میں نئی روشنی کی ضمانت بن جائے۔

صفدر امام قادری

چیرمین، اورینٹل لینگویجز کمیٹی برائے درسی کتاب

صدر شعبۂ اردو، کالج آف کامرس، پٹنہ (بہار)

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

کہکشاں.....

گیارھویں جماعت کی یہ درسی کتاب بازار میں موجود سرکاری یا غیر سرکاری کتابوں سے مختلف نوعیت کی ہو، یہ ہمارا پہلا نشانہ تھا۔ نہ جانے کیوں ہماری درسی کتابوں میں متن کے انتخاب کے مرحلے میں قدامت پسندی، باسی پن اور آزمودہ چیزوں کو پھر سے مرتب کرنے کا چلن رہا ہے۔ تمام اصناف اور شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والی شاملِ نصاب تحریروں کا جائزہ لیا جائے تو اُن میں بار بار چند شخصیات اور مخصوص اسباق کو دہرانے کی ایک عادت رہی ہے۔ ہم نے اس کتاب کی ترتیب میں یہ خیال رکھا کہ نصاب میں بار بار آزمائے اسباق سے قطع نظر کارآمد نئے متن کی تلاش کی جائے۔ اس لیے ہماری اس کتاب میں طلبہ کو نوّے فی صد ایسی تخلیقات ملیں گی جنھیں کورس کی دیگر کتابوں میں تلاش کرنا ممکن نہیں۔ اس سے ہمارے اساتذہ اور طلبہ دونوں کو اس کتاب کے مطالعے کے دوران ایک ادبی تازگی کا احساس ہوگا۔

انتخابِ متن کے عمل میں اب تک کلاسیکی ادب کی طرف ایسا جھکاو رہا ہے کہ ہم عصر ادب کے لیے درسی کتابوں کے دروازے تقریباً بند نظر آتے ہیں۔ بچّہ جب ادب کی طرف بڑھنا چاہتا ہے، اس مرحلے میں کلاسیکی ادب کی مشکل زبان دشواریاں پیدا کرتی ہے۔ اس سے یہ بھی نقصان ہوتا ہے کہ بچّہ کلاسیکی ادب اور معاصر ادب دونوں سے دور ہونے لگتا ہے۔ دورانِ تدریس پیش آنے والے ان مسائل اور شعبۂ تعلیم میں نئے تصوّرات، دونوں نے ہمیں یہ راہ دکھائی کہ اپنے نصاب میں معاصر ادب کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ طالب علم جس زمانے میں ہے، اس زمانے کی زبان سے پورے طور پر ہم آشنا رہے۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ مواد بچّے کے عہد سے قریب کا ہونا چاہیے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم نے کتاب تیار کرتے ہوئے کلاسیکی متن سے فرار کی کوئی صورت پیدا کرلی ہے۔ ہمارا محدود تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ہمیں زبان کے معاملے میں جدید سے قدیم کی طرف کا سفر طے کرنا چاہیے۔ اسی لیے گیارھویں جماعت میں ہم نے اٹھارھویں صدی سے تین مصنفین کو منتخب کیا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف اوّل سے تین اور نصف دوم سے چار لکھنے والے ہمارے انتخاب میں شامل ہیں۔ بیسویں صدی کے نصف اوّل کے مصنفین جہاں سات کی تعداد میں شامل کتاب ہیں، وہیں نصف دوم میں یہ تعداد بڑھ کر دس ہو جاتی ہے۔ اسی طرح باحیات مصنفین کا واجب حق ادا کرتے ہوئے ہم نے نثر و نظم میں پچیس فیصد (25%) ان کے لیے مخصوص کیا ہے۔ ایسے لوگوں سے متعلق نو اسباق یہاں شامل ہیں۔

اس درسی کتاب میں علاقائی، مذہبی اور لسانی اعتبار سے اپنے ملک کی ہمہ گیر تہذیبی اور ثقافتی عناصر کو بھی نمایندگی دینے کا نشانہ مقرر تھا۔ حالاں کہ یہ کتاب بہار کے بچّوں کے لیے ہے لیکن ہم نے اس کا پیمانہ قومی رکھا ہے۔ ہماری کوشش رہی کہ بہار کے اہم مصنفین کے پہلو بہ پہلو ملک کے دوسرے صوبوں کے اہم لکھنے والے بھی اس نصاب کا حصّہ بنیں۔ شاید یہ اچھا لگے کہ اس

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

نصاب میں اتر پردیش، پنجاب، مہاراشٹر، کیرل، آندھرا پردیش جیسے صوبوں کے مصنفین کو شامل کر کے ایک ہمہ گیر ادبی اور ثقافتی صورتِ حال کو اُبھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تہذیبی اور مذہبی اعتبار سے ملے جلے اور رنگا رنگ ماحول کو ملحوظ رکھتے ہوئے نثر و نظم دونوں حصّوں میں غیر مسلم لکھنے والوں کو بھرپور نمایندگی دی گئی ہے۔

ہمارے نصاب میں تمام اہم اصناف کی شمولیت ہر درجے میں ممکن نہیں تھی لیکن یہ اطمینان کی بات تھی کہ مرحلہ وار نصاب تیار کرتے ہوئے ہم نے اصناف اور مصنفین کا ایک ایسا سلسلے وار خاکا تیار کیا جس سے ہماری ادبی تاریخ کی ایک واضح شکل اُبھر کر سامنے آجائے۔ ہمارے نصاب میں اس بات کی گنجایش موجود ہے کہ ہر صنف کے نمائندہ لکھنے والے لازماً ہمارے نصاب کا حصّہ بنیں۔ ہمیں توقع ہے کہ پہلی جماعت سے بارھویں جماعت تک اس نصاب کے مطالعے کے بعد ایک طالب علم اس بنیادی علم کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا جو اعلا جماعتوں میں ادب کے طالب علم کو آگے بڑھنے میں رہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لیے طالب علم جب گیارھویں جماعت کی کتاب کا مطالعہ کریں تو انھیں اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ کچھ اور باتیں وہ بارھویں جماعت میں پڑھیں گے اور اس سے بھی انکار نہیں ہونا چاہیے کہ انھوں نے دسویں جماعت تک بھی ایک خاطر خواہ ادبی معلومات کا ذخیرہ حاصل کر رکھا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ گیارھویں جماعت کی کتاب کوئی تعلیمی جزیرہ نہیں بلکہ یہ پچھلی حصولیابیوں کی بنیاد پر ایک نئی عمارت کا خاکا ہے جسے بارھویں جماعت میں جا کر مزید رنگ و روغن نصیب ہونا ہے۔ اسی لیے اس کتاب میں تمام اصناف یا تمام اہم مصنفین کی شمولیت کے مقابلے میں نمایندہ تخلیقات اور رنگا رنگ ادبی منظر نامہ مرتب کرنے کا نشانہ طے کیا گیا۔

طالب علم کسی خلا میں کتاب کا مطالعہ نہیں کرتا بلکہ اُسے جو سماج میسّر ہے اُسی کے بیچ اپنی نشو و نما کرنی ہے۔ اس لیے یہ لازم ہے کہ گذشتہ کئی صدیوں میں ہندستانی سماج نے جو جدّ و جہد کی ہے اور قربانیاں دی ہیں، انھیں بھی بچّوں کے سامنے رکھا جائے۔ یہ ملک اور یہ سماج ایک دن میں نہیں بنا اور اس کی تشکیل و تعمیر میں ہمارے خواب، جدّ و جہد اور ہزار قربانیاں شامل ہیں۔ اس لیے یہ سب سے ضروری تھا کہ ہم اپنے طالب علم کو ان چیزوں سے بھی آشنا کرائیں۔ غالب کے خط میں اگر غدر کے بعد کے مشکل حالات اُبھر کر سامنے آتے ہیں تو شہید اشفاق اللہ خاں کی شہادت سے چند دنوں پہلے لکھے گئے اپنی ماں کے نام خط کا مطالعہ ہماری قوم کے ہر نوجوان پر فرض ہے۔ قربانی کا جذبہ اور اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے ملک پر مَر مِٹنا کتنا ضروری ہے، اسے جاننے کے لیے چند صفحات کا یہ خط پڑھنا بے حد سود مند ہے۔

پٹنہ بہار کی راج دھانی ہے۔ اس شہر میں سرسیّد احمد خاں نے مشترکہ تہذیب و کلچر کے تعلّق سے وہ یادگار لکچر دیا تھا جسے دنیا بھر میں یاد کیا جاتا ہے۔ سرسیّد کا وہ خطبہ اس کتاب میں شامل ہے۔ اسی طرح سرزمینِ عظیم آباد پر 1881ء میں ایک خاتون نے اردو میں ناول لکھا۔ اس وقت پورے ملک میں عورتیں تعلیم کی طرف بڑھنے کے لیے سوچ بھی نہیں رہی تھیں لیکن اس ناول میں عورتوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب ہونے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ کتاب میں اس ناول سے بھی سبق شامل کیا گیا ہے۔

طلبہ کے لیے اس درسی کتاب میں بہت ساری ایسی چیزیں شامل کی گئی ہیں جن سے انھیں اپنی تعلیمی ترقی میں مدد

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

ملے۔ بہار کے نصاب اور درسی کتاب میں پہلی بار اس قدر تفصیلی مشقیں پیش کی گئی ہیں۔ لفظ و معنی کے تعلق سے بھی تفصیل کو راہ دی گئی ہے۔ قواعد اور دوسرے ادبی اور فنی پہلوؤں پر بچّوں کی نگاہ پڑے، اس کے لیے بھی ان مشقوں میں گنجایش پیدا کی گئی ہے۔ انھی اسباب سے اس کتاب کی ضخامت بڑھی ہے لیکن یہ بستے کا بوجھ نہیں بلکہ درسی کتاب کو آسان اور دل چسپ بنانے کی ہماری ایک مہم ہے۔ ہمارے اساتذہ کرام جنھیں بعض ضروری مواد اپنے شہر یا اسکول کی لائبریریوں میں دستیاب نہیں ہو پاتا، اُن کی مدد کے لیے ہماری تفصیلی مشقیں کارگر ثابت ہوں گی۔

اس کتاب میں اردو میں موجود املائی انتشار سے بچنے کی حتی المقدور کوشش کی گئی ہے۔ انجمن ترقّی اردو، ہند کی سفارشات اور رشید حسن خاں کی قاموسی کتاب ''اردو املا'' کو رہنما تسلیم کیا گیا ہے۔ طلبہ اور اساتذہ سے مخلصانہ گزارش ہوگی کہ اردو کے اس نئے، سائنٹفک اور موزوں نظامِ املا کو پورے طور پر قبول کریں تاکہ املا کی سطح پر یکسانیت کا ماحول قائم ہو۔ اس کے لیے ہمارے کلاس روم سے بہتر کوئی اور تجربہ گاہ نہیں ہے۔ آیندہ کی کتابوں میں بھی ہماری کوشش ہوگی کہ املا کی سطح پر یکسانیت قائم رہے۔ یہ باتیں اس لیے یہاں گوش گزار کی گئیں تاکہ یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو کہ غیر ضروری طور پر بعض الفاظ کی رائج صورت کو بدلا جا رہا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بہت غور و فکر اور ماہرین لسانیات و املا کی سفارشات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان تبدیلیوں کو راہ دی گئی ہے۔

ہر مرحلے میں ہماری یہ کوشش رہی کہ درسی کتاب کا ایک صفحہ بھی نہ گراں بار ہو اور نہ دل چسپی سے خالی رہے۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں تھی کہ ہمارے وقیع ادبی سرمایے سے طالب علم کو پورے طور پر واقف بھی ہونا ہے۔ یہ نکتہ بھی ملحوظ رہا کہ جب یہ درسی کتاب تمام ہو اور ایک سال کی تعلیم و تدریس کا طالب علم احتساب کرے تو اُسے محسوس ہو کہ اس نے اچھا خاصا مواد حاصل کر لیا ہے لیکن اُسی لمحے اس تشنگی کا بھی احساس ہو کہ ابھی بہت کچھ سیکھنا باقی ہے اور اس نے جو پایا ہے، اُس سے ہزاروں گنا زیادہ ابھی حاصل کرنا ہے۔ یہ تمنّا اگر ہمارے طلبہ کے جی میں سما گئی تو یہی ہماری اصل کامیابی ہوگی۔ اسی خواب اور تصور کے سہارے اس درسی کتاب کو تیار کیا گیا ہے۔

ترنّم جہاں	ظفر کمالی	صفدر امام قادری
معاون کوآرڈینیٹر (اردو)	کوآرڈینیٹر (اردو)	چیرمین، اورینٹل لینگویجز کمیٹی

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

فہرست

حصّۂ نثر

خطبہ [4 — 9]

ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں — سرسیّد احمد خاں — 6

خط [10 — 33]

بہ نام میر مہدی مجروح — اسد اللہ خاں غالبؔ — 12
بہ نام ہرگوپال تفتہ — اسد اللہ خاں غالبؔ — 13
بہ نام علاء الدین خاں علائی — اسد اللہ خاں غالبؔ — 14
جیل سے والدہ کے نام خط — اشفاق اللہ خاں (شہید) — 26

مختصر افسانہ [34 — 93]

روشنی — پریم چند — 36
انوکھی مسکراہٹ — سیّد محمد محسن — 49
باغ کا دروازہ — طارق چھتاری — 63
خوشبو — غزال ضیغم — 77
سیلاب (ترجمہ شدہ ملیالی کہانی) — تکشی شیو شنکر پلّے — 87

مضمون [94 — 103]

شے لطیف (علمی مضمون) — سیّد حامد — 96

ناول [104 — 125]

اصلاح النسا (اقتباس) — رشیدۃ النسا — 107
پانی (اقتباس) — غضنفر — 117

ڈراما [126 — 144]

انارکلی (اقتباس) — امتیاز علی تاج — 129

خاکا [145 — 158]

کلیم الدین احمد — احمد جمال پاشا — 147

حصّۂ شاعری

نظم

[161 — 186]

آنا دال	نظیر اکبر آبادی	164
مناظرۂ رحم وانصاف	الطاف حسین حالی	168
پھول	علامہ اقبال	173
جاوید کے نام	علامہ اقبال	174
معرکۂ جہیز و دین مہر (ظریفانہ نظم)	رضا نقوی واہی	178
سفید رات (ترجمہ شدہ ہندی نظم)	آلوک دھنوا	182

غزل

[187 — 204]

آہ سحر نے سوزشِ دل کو مٹا دیا	محمد تقی میر	189
سُنا ہے حال ترے کُشتگاں بچاروں کا	محمد تقی میر	189
خواب میں مجھ کو خیالِ نرگسِ مستانہ تھا	خواجہ حیدر علی آتش	194
کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے	خواجہ حیدر علی آتش	194
تاثیر صبر میں نہ اثر اضطراب میں	مومن خاں مومن	198
ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو	مومن خاں مومن	198
کدورت اے دلِ محزوں کہاں نکلتی ہے	شاد عظیم آبادی	202
قدر ہنر تھی جن سے، وہ اہلِ نظر گئے	شاد عظیم آبادی	202

شخصی مرثیہ

[205 — 211]

لفظوں کی بھیگی آنکھیں	ظفر گورکھ پوری	207

مثنوی

[212 — 227]

سحر البیان (اقتباس)	میر حسن	214

مزید مطالعے کے لیے

مضمون [230 — 243]

میر کلو کی گواہی (ظریفانہ مضمون) — انجم مانپوری — 231

علامہ ظہور (ظریفانہ مضمون) — کنھیا لال کپور — 239

انٹرویو [244 — 253]

میں ساڑی رپورٹر کہلاتی تھی — قرۃ العین حیدر — 246

حمد [254 — 258]

ترا ہی بحر، سفینہ رواں بھی تیرا ہے — مظہر امام — 256

نظم [259 — 275]

ملاقات — فیض احمد فیض — 260

زنداں کی ایک شام — فیض احمد فیض — 261

ڈاسنہ سٹیشن کا مسافر — اختر الایمان — 266

اتمامِ سفر سے پہلے کا پڑاو — اختر الایمان — 268

میرا وطن یہی ہے — ساجدہ زیدی — 271

غزل [276 — 279]

دل میں اک لہری اٹھی ہے ابھی — ناصر کاظمی — 277

کچھ یادگارِ شہرِ ستمگر ہی لے چلیں — ناصر کاظمی — 277

مثنوی [280 — 284]

سوز و گداز (اقتباس) — شوق نیموی — 281

رباعی [285 — 297]

رباعیات — امجد حیدر آبادی — 287

رباعیات — فراق گورکھ پوری — 291

رباعیات — جمیل مظہری — 295

خطبہ

خطبے کا تعلق تخلیقی ادب سے نہیں ہے لیکن علوم کی مذہبی اور دانش ورانہ تاریخ کا مطالعہ کریں تو خطبات کی اہمیت واضح ہو جائے گی۔ مذاہب میں پیغمبران، اولیاے کرام اور علماے دین کی وہ باتیں خطبے کے ذیل میں آتی ہیں جن میں عوام کی ہدایت کے لیے کوئی خاص پیغام ہو۔ ہندستان میں جدید تعلیم کے فروغ کے دور میں خطبات کو باضابطہ شکل ملی۔ بالخصوص علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کے دوران مختلف دانش وروں نے ملک کے طول وعرض میں جو عوامی خطابات کا سلسلہ قائم کیا، انھیں مقبولیت حاصل ہوئی۔ انگریزوں کے یہاں ایسے خطابات بہت اہتمام کے ساتھ تہذیب کا حصّہ بن چکے تھے اور دانش وران اپنے خطبات تحریری شکل میں پیش کرنا شروع کر چکے تھے۔

ہندستان میں قومی تحریک کے زمانے میں کانگریس صدور کے لکچرز کی تاریخی اہمیت قائم ہوئی۔ لیکن اس سے قبل سرسیّد احمد خاں، ان کے دیگر رفقا اور وویکانند کے خطبات اپنی افادیت اور علمی اعتبار کی وجہ سے یادگار بن چکے تھے۔ اردو والوں میں سرسیّد ان ابتدائی لوگوں میں ہیں جنھوں نے اپنی خصوصی تقاریر کو تحریری شکل دے کر دائمی حیثیت عطا کی۔ ڈپٹی نذیر احمد، شبلی نعمانی، علاّمہ اقبال، سیّد سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد، ذاکر حسین اور سیّد ابوالحسن علی ندوی کے خطبات ہمارے لیے اثاثہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سب کے خطبات کی علمی اور دانش ورانہ بنیادیں بہت مضبوط ہیں اور انھیں کی کوششوں سے ہندستان کی سیاسی اور سماجی زندگی میں سینکڑوں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔

خطبہ (جمع - خطبات)، خطاب، لکچر، اڈریس جیسی اصطلاحیں اردو میں بھی رائج ہیں۔ انھیں عمومی گفتگو یا تقریر سے صرف اس لیے الگ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ان کے خطاب کنندگان بڑے دانش ور ہوتے ہیں اور اکثر وبیش تر ان کے موضوعات بھی مخصوص ہوتے ہیں۔ ایسے خطبات کے لیے خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ بالعموم یہ خطبات عقلی اور معروضی بنیادوں پر حالات اور واقعات کے تجزیے کے لیے وقف ہوتے ہیں۔ ہر خطبے کا یہ لازمی مقصد ہوتا ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ لوگ سنیں اور اس سے بڑا عوامی اور قومی فائدہ حاصل ہو۔

سرسیّد احمد خاں

سیّد احمد خاں 17 اکتوبر 1817ء کو دلّی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام میر متقی اور دادا کا نام سیّد ہادی تھا۔ ان کے اسلاف شاہ جہاں کے زمانے میں ہندستان آئے اور مختلف بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ یہ گھرانا بے حد معزز اور مذہبی تھا۔

سیّد احمد خاں کی ابتدائی تعلیم ان کی ماں عزیز النسا بیگم کے ذریعے ہوئی جنھوں نے قرآنِ کریم کے چند پارے اور اردو کی ابتدائی کتابیں پڑھائیں۔ انھوں نے بیٹے کی تربیت بھی بہت خوش اسلوبی سے کی۔ چوں کہ سیّد احمد خاں کا بچپن اپنی ننھیال میں گزرا تھا، لہٰذا ان کی ذہنی تربیت میں ان کے نانا خواجہ فرید الدین کا بھی بڑا ہاتھ رہا۔ سرسیّد نے مشہور عالمِ دین مولانا حمید الدین اور دیگر اساتذہ سے کسبِ فیض کرتے ہوئے عربی، فارسی، طب اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔

1836ء میں انیس برس کی عمر میں سیّد احمد خاں کی شادی پارسا بیگم سے ہوئی۔ اپنے والد کی وفات کے بعد 1838ء میں وہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں عارضی سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ 1841ء میں انھوں نے منصفی کا امتحان پاس کیا اور مین پوری میں بہ طور منصف ان کا تقرر ہوا۔ وہاں سے ان کا تبادلہ فتح پور سیکری اور بعد میں دہلی ہوا۔ 1842ء میں بہادر شاہ نے جواد الدولہ عارف جنگ کے خطاب سے نوازا۔ 1855ء میں صدر امین کی حیثیت سے وہ بجنور گئے۔ 10 مئی 1857ء کو جب غدر کی ابتدا ہوئی تو سرسیّد بجنور میں ہی تھے۔ غازی پور میں انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ 1864ء میں ان کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا۔ اپریل 1869ء میں وہ لندن گئے۔ اکتوبر 1870ء میں وہاں سے واپسی کے بعد رسالہ "تہذیب الاخلاق" کا اجرا کیا۔ 1875ء میں "مدرسۃ العلوم" (محمڈن اینگلو اورینٹل اسکول اور کالج) کی بنیاد ڈالی جو اُن کے مرنے کے بعد ترقی کرتے ہوئے 1920ء میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔ سیّد احمد خاں کو انگریزی حکومت نے "سر" کے خطاب سے بھی نوازا جو اُن کے نام کا حصہ بن گیا۔ 27 مارچ 1898ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

سرسیّد نے اپنے تعلیمی اور اصلاحی کاموں کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف میں بھی خصوصی دلچسپی لی اور کئی یادگار کتابیں لکھیں جن میں "آثار الصنادید"، "خطباتِ احمدیہ"، "اسبابِ بغاوتِ ہند"، "تفسیر القرآن" اور "تبیین الکلام" بہ طور خاص اہم ہیں۔ انھوں نے کئی اہم تاریخی کتابوں کو بھی مرتب کیا۔ انھوں نے کثیر تعداد میں اصلاحی مضامین بھی قلم بند کیے۔

سرسیّد اور ان کے رفقا نے اردو نثر میں سادہ بیانی اور مختصر نویسی کو رواج دیا اور اس زبان کو ترقی کی نئی بلندیاں عطا کیں۔ ان کی ہمہ جہت ادبی خدمات کو دیکھتے ہوئے انھیں اردو نثر کا بابا آدم بھی کہا جاتا ہے۔ سرسیّد نے اپنے وطن اور ابنائے وطن بالخصوص مسلمانوں کے لیے بڑی قربانیاں دیں۔ مسلمانوں کو غدر کے صدمے کو بھلا کر جدید تعلیم کی جانب راغب کیا۔ وہ ایک بڑے مصلح اور بڑے ادیب کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

سرسیّد احمد خاں

خطبہ

ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں

اے میرے دوستو!

تمھارے ملک ہندستان میں دو قومیں آباد ہیں جو ہندو اور مسلمان کے نام سے مشہور ہیں۔ جس طرح کہ انسان میں بعض اعضاے رئیسہ ہیں، اسی طرح ہندستان کے لیے وہی دونوں قومیں بہ منزلۂ اعضاے رئیسہ کے ہیں۔ ہندو ہونا یا مسلمان ہونا انسان کا اندرونی خیال بالعقیدہ ہے جس کو بیرونی معاملات اور آپس کے برتاو سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ کیا خوب کہا ہے جس نے کہا ہے کہ انسان کے دو حصّے ہیں۔ اس کے دل کا خیال یا عقل خدا کا حصّہ ہے اور اس کا اخلاق اور میل جول اور ایک دوسرے کی ہمدردی اس کے ابناے جنس کا حصّہ ہے۔ پس خدا کے حصّے کو خدا پر چھوڑ دو اور جو تمھارا حصّہ ہے، اس سے مطلب رکھو۔

اے عزیزو! جس طرح ہندوؤں کی شریف قومیں اس مُلک میں آئیں، اُسی طرح ہم بھی اس ملک میں آئے۔ ہندو اپنا ملک بھول گئے۔ اپنے دیس سے پردیس ہونے کا زمانہ اُن کو یاد نہیں رہا اور ہندستان ہی کو اُنھوں نے اپنا وطن سمجھا اور یہ جانا کہ ہمالیہ اور بندھیا چل کے درمیان ہی ہمارا وطن ہے۔ ہم کو بھی اپنا ملک چھوڑے سینکڑوں برس ہو گئے۔ نہ وہاں کی آب و ہوا ہم کو یاد ہے، نہ اس ملک کی فضا کی خوبصورتی، نہ وہاں کے پھلوں کی تر و تازگی اور نہ میووں کی لذّت اور نہ اپنے مقدّس ریتیلے و کنکریلے ملک کی برکت۔ ہم نے بھی ہندستان کو اپنا وطن سمجھا اور اپنے سے پیش قدموں کی طرح ہم بھی اس ملک میں رہ پڑے۔ پس اب ہندستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے۔ ہندستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں۔ مقدّس گنگا جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں۔ ہندستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں۔ مرنے میں، جینے میں، دونوں کا ساتھ ہے۔

ہندستان میں رہتے رہتے دونوں کا خون بدل گیا۔ دونوں کی رنگتیں ایک سی ہو گئیں۔ دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئیں۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سینکڑوں رسمیں اختیار کر لیں۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کی سینکڑوں عادتیں لے لیں۔ یہاں تک کہ ہم دونوں آپس میں ملے۔ ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان اردو پیدا کر لی جو نہ ہماری زبان تھی نہ اُن کی۔ پس اگر ہم اس حصّے سے جو ہم دونوں میں خدا کا حصّہ ہے، قطع نظر کریں تو درحقیقت ہندستان میں ہم دونوں بہ اعتبار اہلِ وطن ہونے کے ایک قوم ہیں۔ اور ہم دونوں کے اتفاق اور باہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی و بہبودی ممکن ہے۔ اور آپس کے نفاق اور ضد و عداوت اور دوسرے کی

بدخواہی سے ہم دونوں برباد ہونے والے ہیں۔ افسوس ہے ان لوگوں پر جو اس نکتے کو نہیں سمجھتے اور آپس میں ان دونوں قوموں میں تفرقہ ڈالنے کے خیالات پیدا کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس مضرت اور نقصان میں خود بھی شامل ہیں اور آپ اپنے پانو پر کلھاڑی مارتے ہیں۔

اے میرے دوستو! میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندستان ایک دلہن کے مانند ہے جس کی خوب صورت اور رسیلی آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دلھن بھینگی ہو جاوے گی۔ اور اگر ایک دوسرے کو برباد کریں گے تو وہ کانڑی بن جاوے گی۔ پس اے ہندستان کے رہنے والے ہندو مسلمانو! اب تم کو اختیار ہے کہ چاہو اس دلھن کو بھینگا بناؤ، چاہو کانڑا۔

بے شک انسانوں میں باہم کبھی کبھی رنج ہو جانا ایک قدرتی بات ہے۔ ہندو اور مسلمانوں پر موقوف نہیں ہے۔ آپس میں، ہندو ہندوؤں میں، مسلمان مسلمانوں میں، بھائی بھائیوں میں، باپ بیٹوں میں، ماں بیٹیوں میں رنج ہو جاتا ہے۔ مگر اس رنج کو قائم رکھنا اور پکائے جانا اور بڑھائے جانا انسان کی، ملک کی، قوم کی، خاندان کی پوری بدبختی ہے۔ کیا مبارک ہیں وہ لوگ جو معافی چاہتے ہیں اور اس گرہ کے کھولنے میں جو محبت میں اتفاق سے پڑ گئی ہے، پیش قدمی کرتے ہیں اور اپنے بھائی یا ہم وطن یا ہم قوم سے بے قصور ہونے پر بھی معافی چاہتے ہیں اور محبت کو ٹوٹنے نہیں دیتے۔ مقلّبُ القلوب! تو ہندستان کے لوگوں کے دلوں کو اسی طرف پھیر دے۔

(۲۷/جنوری ۱۸۸۳ء کو پٹنہ میں دیا گیا لکچر)

لفظ و معنی

عضو	-	جسم کا حصہ، (جمع اعضا)
اعضائے رئیسہ	-	جسم کے اہم حصے جیسے دماغ، دل، جگر وغیرہ
بہ منزلۂ	-	بجائے، بہ طور
عقیدہ	-	مذہبی اصول کو ماننا، بھروسہ، اعتبار
بالعقیدہ	-	عقیدے کے ساتھ
ابنائے جنس	-	ایک ہی جنس کے، ہم جنس
مقدس	-	پاک، احترام کے لائق
مُشابہ	-	ملتا جلتا، مانند، مثل، مطابق
قطعِ نظر	-	نظر ہٹانا
بہبودی	-	بھلائی

بدخواہی - بُرا چاہنا
تفرقہ - فرق، نااتفاقی، نفاق، پھوٹ
مُضرّت - نقصان، ضرر
اپنے پانو پر کلھاڑی مارنا - اپنا بُرا آپ کرنا
کانڑی - ایک آنکھ سے اندھی
مَوقُوف - چھوڑ دیا گیا، برخاست کیا گیا
گرہ کھولنا - گانٹھ کھولنا، دل کی رنجش دور کرنا
پیش قدمی - پہل، آغاز، چڑھائی، جرأت
قلب - دل (جمع قلوب)
مقلب القلوب - دلوں کو پھیرنے والا، ارادہ بدل دینے والا، اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہے

آپ نے پڑھا

- ہندو ہونے یا مسلمان ہونے کا تعلق عقیدے سے ہے۔ انسان ہونے کی حیثیت سے ایک انسان کا دوسرے انسانوں سے برتاؤ محض عقیدے کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ وہ جن کے بیچ رہتا ہے، ان کے لیے اس کے دل میں اخلاق، محبت اور ہمدردی کا جذبہ ہوتا ہے۔ اسی زاویۂ نگاہ کے پیشِ نظر سرسیّد احمد خاں نے ہندو اور مسلمانوں کے بیچ بڑھ رہے آپسی نفاق اور رنجش کو دور کرنے کے لیے دلیلوں، مثالوں اور تاریخی حوالوں کا اپنے خطبے میں استعمال کیا ہے۔
- دونوں قومیں ہندستان کی دھرتی پر مختلف مقامات سے آکر بسیں۔ انھوں نے اسی کو اپنا وطن مان لیا اور اب یہی اُن کے جینے اور مرنے کی جگہ ہے۔ ایک ہی دھرتی کے باشندہ ہونے کے سبب دونوں دو قومیں نہیں بلکہ ایک قوم ہیں۔
- مذہب اور عقیدے سے الگ مخصوص جغرافیائی حدود میں بسنے والے انسانی گروہوں کو ایک قوم قرار دینا سرسیّد احمد خاں کی روشن خیالی اور وسیع النظری کی دلیل ہے۔
- ہندوؤں اور مسلمانوں کے جس اجتماع کو انھوں نے خطاب کیا؛ آسان لفظوں اور سمجھ میں آجانے والی سامنے کی مثالوں کے ذریعہ سب کو قائل کرنے کی کوشش کی، اس کے واقعتاً دُور رس نتائج سامنے آئے۔
- یہ سرسیّد احمد خاں کا نہایت مشہور خطبہ ہے جو عظیم آباد میں دیا گیا۔ اس خطبے سے سرسیّد کی روشن خیالی، جذبۂ خیر سگالی، اخوت اور بھائی چارے میں ان کے اعتماد کا پتا چلتا ہے۔

آپ بتائیے

1- سرسیّد احمد خاں کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟
2- ان کے اردو رسالے کا نام کیا تھا؟ یہ کب سے شائع ہونا شروع ہوا؟

3- علی گڑھ میں قائم ہونے والے ان کے مدرسے کا کیا نام تھا؟ یہ مدرسہ کب قائم ہوا؟
4- 1857ء کے غدر کے متعلق لکھی ہوئی ان کی کتاب کا کیا نام ہے؟
5- کیا سرسیّد ہندو مسلم اتحاد کی حمایت کرتے تھے؟
6- ''ہندستان ایک دلھن کے مانند ہے۔'' انھوں نے یہ بات کیوں کہی؟

مختصر گفتگو

1- ملک کی ترقّی کے لیے سرسیّد ہندو مسلم اتحاد کو کیوں ضروری خیال کرتے تھے؟
2- ہندستانی قومیت کے فروغ میں سرسیّد کی خدمات واضح کیجیے؟
3- سرسیّد کی حیات کے تعلّق سے آپ کیا جانتے ہیں؟ بتائیے۔
4- ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین محبت پیدا کرنے کے لیے کس طرح کی پیش قدمی پر سرسیّد نے زور دیا ہے؟

تفصیلی گفتگو

1- سرسیّد کے خطبے کے اہم نکات واضح کیجیے۔
2- سرسیّد کی تعلیمی خدمات پر روشنی ڈالیے؟
3- کیا سرسیّد احمد خاں جدید ہندستان کے معمار ہیں؟ دلیلوں کے ساتھ واضح کریں۔
4- ''جس طرح ہندوؤں کی شریف قومیں اس مُلک میں آئیں، اُسی طرح ہم بھی اس ملک میں آئے''۔ کیا سرسیّد کا یہ خیال ایک تاریخی حقیقت ہے؟
5- ''افسوس ہے ان لوگوں پر جو اس نکتے کو نہیں سمجھتے اور آپس میں ان دونوں قوموں میں تفرقہ ڈالنے کے خیالات پیدا کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس مضرّت اور نقصان میں خود بھی شامل ہیں اور آپ اپنے پانو پر کلھاڑی مارتے ہیں۔'' سرسیّد کی اس عبارت کی تشریح کیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1- سرسیّد کے اس خطبے کو ایک طالب علم یا چند طلبہ زبانی یاد کرلیں اور اسے اساتذہ اور طلبہ پر مشتمل سامعین کے ایک اجتماع میں خطبے کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے سنائیں۔ طالب علم کی آواز بلند، اُس کا لہجہ متین و شایستہ اور اُس کے کھڑا ہو کر سنانے کا انداز پُر وقار ہونا چاہیے۔
2- اسکول کی لائبریری میں سرسیّد کی کتابوں کی تلاش کیجیے اور ان کے اہم اقوال منتخب کیجیے۔
3- سرسیّد کی تحریک کے چند رفقا کی تصاویر اور ان کے حالاتِ زندگی جمع کیجیے۔

خط

خط، خیریت کی ترسیل اور تبادلۂ خیالات کا بنیادی ذریعہ ہے۔ یہ اُسے لکھا جاتا ہے جو حاضر نہیں ہوتا۔ انسان اپنی کسی ضرورت سے، چاہے وہ ذاتی ہو یا قومی، خط لکھتا ہے۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انسان نے جب سے لکھنے اور پڑھنے کا سلسلہ قائم کیا، اسی زمانے سے دنیا میں خط آنے جانے کا رواج قائم ہوا ہوگا۔ جیسے جیسے انسانی آبادی میں اضافہ ہوا اور ترقی، خوش حالی اور تحفظ کے سبب لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے لگے، شاید انھی دنوں قبیلے کے احوال جاننے اور بتانے کے لیے خط کا پہلے پہل استعمال کیا گیا۔

عہدِ جدید میں بالخصوص مغربی تعلیم کے فروغ کے زمانے میں مکتوب نویسی کا باضابطہ سلسلہ اس وجہ سے قائم ہوا کیوں کہ ان خطوط کے لانے اور لے جانے کو ادارہ جاتی استحکام ملا۔ ہندستان میں بھی سولھویں صدی کے آغاز میں شیر شاہ سوری نے محکمۂ ڈاک جیسی ابتدائی تنظیم کو کامیابی کے ساتھ قائم کیا تھا۔ مغل حکومت کے زمانے میں فارسی میں مکتوب نویسی کا رواج تھا۔ علمائے کرام، بادشاہ، اُمرا اور رؤسا یا ادبا و شعرا کے جو خطوط آج محفوظ ہیں، وہ سب کے سب فارسی میں ہیں۔ یہاں تک کہ اردو کے شعرا بھی بہ شمول مکتوب نویسی تمام نثری کام فارسی میں ہی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اردو میں اہم شعرا و ادبا کی طرف سے لکھے جانے والے خطوط کی تاریخ مرتب کریں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ 1846ء کے بعد ہی غالب نے اردو میں اپنے احباب کو خطوط لکھنا شروع کیا۔ اسی زمانے میں غلام غوث بے خبر بھی اردو مکتوب نویسی کی طرف آئے۔ غالب نے اپنی زندگی کی آخری دو دہائیوں میں تقریباً 900 خطوط اپنے عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں کے نام روانہ کیے۔ ان کے خطوط کے دو مجموعے ان کی زندگی میں ہی شائع ہو گئے۔ غالب کے بعد سرسیّد، حالی، شبلی، ابوالکلام آزاد، سیّد سلیمان ندوی، علامہ اقبال، مہدی افادی، عبدالماجد دریابادی، پریم چند، فیض احمد فیض، صفیہ اختر وغیرہ کے خطوط کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ یہ مکتوبات اطلاعات کا بڑا خزینہ ہیں اور ان سے زندگی کے سینکڑوں پوشیدہ پہلو آئینہ ہو جاتے ہیں۔

خط ذاتی نوعیت کی چیز ہے۔ مکتوب نگار کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جسے لکھ رہا ہے، وہی اسے دیکھے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیش تر مکتوب نگار اپنے دل کی وہ باتیں بھی لکھ جاتے ہیں جنھیں دوسرے مواقع پر اُسے پیش کرنے میں دشواری ہو سکتی تھی۔ جذبات کی جس رَو میں مکتوب نویس نے خط لکھا اور اُسے روانہ کر دیا، وہ خط چھوٹا ہوا تیر ہوتا ہے۔ مکتوب نگار جس زمانے یا جس مقام سے خط لکھتا ہے، وہ اپنے حالات بیان کرتے ہوئے بے ارادہ اپنے زمانے اور دوسروں کے احوال بھی متوازی طور پر رقم کرتا چلتا ہے۔ اسی لیے کسی بھی اہم شخصیت کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے خطوط نہایت ضروری اور سنجیدہ ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ غالب کے خطوط اردو کی ادبی تاریخ کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں جہاں سچائی اور بر ملا اظہارِ بیان نے اپنی معراج حاصل کر لی ہے۔

اسداللہ خاں غالب

مرزا غالبؔ جن کا پورا نام اسداللہ بیگ خان تھا، 27 دسمبر 1797ء کو اپنی ننھیال آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مرزا عبداللہ بیگ اور والدہ کا عزت النسا بیگم تھا۔ غالبؔ کے نانا خواجہ مرزا غلام حسین خاں سرکار میرٹھ کے ایک فوجی افسر اور آگرہ کے عمائد میں سے تھے۔

غالب ابھی بچے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ والد کے انتقال کے بعد اُن کے چچا نصراللہ بیگ خاں نے انھیں اپنی سرپرستی میں لے لیا لیکن چند برسوں بعد وہ بھی اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔ اس کے بعد غالب اپنی ماں کی سرپرستی میں رہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں لیکن اتنا پتا ہے کہ فارسی کی ابتدائی تعلیم مولوی معظم کے ذریعے ہوئی۔ مولوی معظم کے مکتب کے زمانے میں ہی غالب کی شعرگوئی کی ابتدا ہو چکی تھی۔

تیرہ برس کی عمر میں غالب کی شادی خاندانِ لوہارو میں الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ شادی کے چند برسوں بعد انھوں نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ دہلی میں انھیں خاصی مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ خاندانی پنشن کے سلسلے میں انھوں نے کلکتے کا طویل سفر کیا لیکن انھیں نامرادی ہاتھ لگی۔ جب اُن کا باضابطہ تعلق قلعۂ معلّا سے ہوا تو حالات میں قدرے بہتری آئی لیکن غدر کے ہنگامے نے ساری بساط ہی پلٹ دی۔ رام پور کے دربار سے وابستگی اور قلعۂ معلّا سے پنشن کی واگذاشت کے باوجود وہ پریشان ہی رہے اور اسی عالم میں 15 فروری 1869ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

غالب نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھا۔ ''پنج آہنگ''، ''مہرِ نیم روز''، ''دستنبو''، ''قاطع برہان''، ''درفشِ کاویانی'' اور ''کلیاتِ نظمِ فارسی'' وغیرہ ان کی فارسی تصنیفات ہیں۔ اردو میں متداول دیوان کے علاوہ مرزا کی زندگی میں ہی ان کے اردو خطوط کے دو مجموعے ''عودِ ہندی'' اور ''اردوے معلّا'' کے نام سے چھپے۔ بعد میں لوگوں نے مختلف ناموں سے ان کی بکھری تخلیقات کو اکٹھا کر کے شائع کیا۔ ان کا تخلص پہلے اسدؔ تھا، بعد میں انھوں نے غالبؔ تخلص اختیار کیا۔ غالبؔ کی طبیعت میں جدّت پسندی تھی۔ شروع میں انھوں نے معروف فارسی شاعر بیدلؔ کی پیروی کی لیکن بہت جلد اس رنگ کو چھوڑا اور نئی راہ اختیار کی۔

غالبؔ کے خطوط بھی اردو ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ اپنے مکتوبات میں انھوں نے بے تکلفانہ لہجہ اختیار کیا۔ بیان کی سادگی، لہجے کے سوز اور ظریفانہ اندازِ بیان نے ان کے خطوط کو خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔ اس سے نہ صرف غالب کی ذہنی روش کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان کی شخصیت بھی نکھر کر ہمارے سامنے آتی ہے۔

اسداللہ خاں غالبؔ

بہ نام میر مہدی مجروح

ہاں صاحب! تم کیا چاہتے ہو؟ ''مجتہد العصر'' کے مسوّدے کو اصلاح دے کر بھیج دیا۔ اب اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عمر نہیں جو سلام لکھوں۔ میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں۔ تمھارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافے گریدا کرو، مسوّدے کے کاغذ کو بار بار دیکھا کرو، پاؤ گے کیا؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں۔ ''یہاں خیریت ہے، وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمھارا بہت دن کے بعد پہنچا، جی خوش ہوا۔ مسوّدہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔ برخوردار! میر سرفراز حسین کو دعا دینا اور دعا کہنا۔ اور ہاں، حکیم میر اشرف علی اور میر افضل علی کو بھی دعا کہنا۔ لازمۂ سعادت مندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح خط بھیجتے رہو۔'' کیوں؟ سچ کہیو، اگلوں کے خطوں کی تحریر کی یہی طرز تھی یا اور؟ ہائے! کیا اچھا شیوہ ہے! جب تک یوں نہ لکھو، وہ خط ہی نہیں ہے۔ چاہِ بے آب ہے، ابرِ بے باراں ہے، نخلِ بے میوہ ہے، خانۂ بے چراغ ہے، چراغِ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں، تم زندہ ہو، تم جانتے ہو کہ ہم زندہ ہیں۔ امرِ ضروری کو لکھ لیا، زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا، اور اگر تمھاری خوشنودی اسی طرح کی طرزِ نگارش پر منحصر ہے تو بھائی! ساڑھے تین سطریں ویسی بھی میں نے لکھ دیں۔ کیا نمازِ قضا نہیں پڑھتے اور وہ مقبول نہیں ہوتی؟ خیر! ہم نے بھی وہ عبارت جو مسوّدے کے ساتھ لکھی تھی، اب لکھ بھیجی۔ قصور معاف کرو۔ خفا نہ ہو۔

میر نصیر الدین ایک بار آئے تھے، پھر نہ آئے۔ نثرِ فارسی میں نے کہاں لکھی کہ تمھارے چچا کو یا تم کو بھیج دوں۔ نواب فیض محمد خاں کے بھائی حسن علی خاں مر گئے۔ حامد علی خاں کی ایک لاکھ تیس ہزار کئی سو روپے کی ڈگری بادشاہ پر ہو گئی۔ کلو داروغہ بیمار ہو گیا تھا، آج اس نے غسلِ صحت کیا۔ باقر علی خاں کو مہینا بھر سے تپ آتی ہے۔ حسین علی خاں کے گلے میں دو غدود ہو گئے ہیں۔ شہر چپ چاپ، نہ کہیں بھاؤ اجتا ہے، نہ سُرنگ لگا کر کوئی مکان اُڑایا جاتا ہے، نہ آہنی سڑک آتی ہے، نہ کہیں دمدمہ بنتا ہے۔ دلّی شہر خموشاں ہے۔

کاغذ بھر گیا ورنہ تمھارے دل کی خوشی کے واسطے ابھی اور لکھتا۔

غالبؔ

22 ستمبر 1861ء

اسد اللہ خاں غالب

خط

بہ نام ہرگوپال تفتہ

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی سے معاف

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

بندہ پرور! پہلے تم کو یہ لکھا جاتا ہے کہ میرے دوستِ قدیم میر مکرم حسین صاحب کی خدمت میں میرا اسلام کہنا اور یہ کہنا کہ اب تک جیتا ہوں اور اس سے زیادہ میرا حال مجھ کو بھی نہیں معلوم۔ مرزا حاتم علی بیگ صاحب مہرؔ کی خدمت میں میرا اسلام کہنا اور یہ میرا شعر میری زبان سے پڑھنا:

شرطِ ایمان بود ورزشِ ایماں بالغَیب　　　اے تو غائب زنظر، مہرِ تو ایمانِ من ست

تمھارے پہلے خط کا جواب بھیج چکا تھا کہ اس کے دو دن یا تین دن کے بعد دوسرا خط پہنچا۔ سنو صاحب! جس شخص کو جس شغل کا ذوق ہو اور وہ اس میں بے تکلف عمر بسر کرے، اس کا نام عیش ہے۔ تمھاری توجہ مُفرط بہ طرف شعر و سخن کے تمھاری شرافتِ نفس اور حسنِ طبع کی دلیل ہے اور بھائی یہ جو تمھاری سخن گستری ہے، اس کی شہرت میں میری بھی تو نام آوری ہے۔ میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی رَوِش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا۔ مگر ہاں! اپنے ہندی کلام میں ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔ سو گاہ گاہ جب دل اُلٹنے لگتا ہے، تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے:

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ!　　　ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خُدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں:

اے مرگِ ناگہاں! تجھے کیا انتظار ہے؟

یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے، اس کا بیان تو معلوم! مگر اُس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو اِن رُوسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا، اور کوئی میرا شفیق، اور کوئی دوست، اور کوئی میرا یار، اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے۔ جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو، اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو! ہائے! اتنے یار مَرے کہ جو اَب مَیں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

1858ء　　　غالبؔ

بہ نام علاءالدین خاں علائی

جانِ غالبؔ! یاد آتا ہے کہ تمھارے عمِ نامدار سے سنا ہے کہ لغاتِ "دساتیر" کی فرہنگ وہاں ہے۔ اگر ہوتی تو کیوں نہ تم بھیج دیتے؟ خیر!

آں چہ مادر کار داریم اکثرے درکار نیست

تم ثمرِ نورس ہو اُس نہال کے جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشو و نما پائی ہے، اور میں ہوا خواہ و سایہ نشین اس نہال کا رہا ہوں، کیوں کر تم مجھ کو عزیز نہ ہو گے؟ رہی دید و ادید، اس کی دو صورتیں: تم دِلّی آؤ یا میں لوہارو آؤں۔ تم مجبور، میں معذور۔ خود کہتا ہوں کہ میرا عذر زنہار مسموع نہ ہو، جب تک یہ نہ سمجھ لو کہ میں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے؟

سنو! عالم دو ہیں: ایک عالمِ ارواح اور ایک عالمِ آب و گِل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے: لِمَنِ الملك اليوم؟ اور پھر آپ جواب دیتا ہے: لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گِل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں، لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چناں چہ میں آٹھویں رجب سنہ ۱۲۱۲ھ میں رو بہ کاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۱۷ رجب سنہ ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکمِ دوامِ حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پانو میں ڈال دی اور دِلّی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زِنداں میں ڈال دیا۔ فکرِ نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ اور پانو بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار۔ مشقتِ مقرری اور مشکل ہو گئی، طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں، سالِ گذشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ، مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مرادآباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکمِ رہائی دیکھیے کب صادر ہو؟ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اسی ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر، بعدِ رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا، میں بھی بعدِ نجات سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا۔

فرّخ آں روز کہ از خانۂ زنداں بروم
سوئے شہرِ خود ازیں وادیِ ویراں بروم

غالبؔ

8/جون 1861ء

لفظ و معنی (خط بہ نام میر مہدی مجروح)

مجتہد - اجتہاد کرنے والا، کتاب اور سنت سے دینی مسائل نکالنے والا
عصر - زمانہ، وقت
مسوّدہ - وہ تحریر یا عبارت جو پہلی دفعہ سرسری طور پر لکھی گئی ہو
اصلاح دینا - درست کرنا، سنوارنا، غلطی نکالنا
روش - طریقہ، چال
برخوردار - بیٹا، خوش، پھولا پھلا
سعادت مندی - نیک بختی، فرماں برداری
شیوہ - طور، طریقہ، انداز
چاہ - کنواں
ابر - بادل، گھٹا
نخل - درخت، کھجور کا درخت
زوائد - زاید کی جمع، فضول اور بحث سے خارج باتیں
امر - کام، بات
خوشنودی - رضامندی، خوشی
طرزِ نگارش - لکھنے کا طریقہ
غسلِ صحت - بیماری سے اچھا ہونے پر نہانا
تپ - بخار
غدود - گلٹی، جسم کے اندر کی گانٹھ
دَمدمہ - مصنوعی قلعہ، مورچہ
نبڑنا - خرچ ہو جانا، باقی نہ رہنا

خط بہ نام ہرگوپال تفتہ

شہرِ خموشاں - قبرستان
تلخ نوائی - ناگوار آواز، کڑوی بات
ذوق - شوق
سخن گستری - شعر کہنا

نام آوری - شہرت
مرگِ ناگہاں - وہ موت جو اچانک آجائے
شفیق - مہربان، ہمدرد
زیست - زندگی، حیات، عمر
امید گاہ - امید کی جگہ، جس سے امید کی جائے

خط بہ نام علاء الدین خاں علائی

ہوا خواہ - خیر خواہ، بھلائی چاہنے والا
عمِ نامدار - نامور چچا
نہال - تازہ لگا ہوا پودا
سایہ نشیں - سائے میں بیٹھنے والا
ثورس - میوۂ تازہ، نیا پکا ہوا پھل
ثمر - پھل
نشو و نما - پھولنا، پھلنا
عذر - بہانہ، معذرت
معذور - مجبور، لاچار
زنہار - ہرگز، کبھی نہیں
مسموع - سنا گیا، قبول کیا گیا
عالمِ ارواح - عالمِ غیب، وہ دنیا جہاں روحیں رہتی ہیں
عالمِ آب و گل - دنیا
روبکاری - مقدمے کی پیشی
حوالات - قید خانہ
دوامِ حبس - عمر قید
صادر ہونا - حکم یا قانون پاس ہونا
زنداں - قید خانہ
شرق - مشرق، پورب
بلاد - بلد کی جمع، شہر

پایانِ کار - آخرکار
گریزپا - بھگوڑا، وحشت زدہ
فگار - زخمی
مشقتِ مقرری - مقرر کی ہوئی سختی
زائل - دور ہونے والا، کم ہونے والا
احتمال - شک، وہم

فارسی اشعار اور عربی فقروں کا اردو ترجمہ

(خط بہ نام ہرگوپال تفتہ)

- شرطِ ایمان بود ورزشِ ایماں بالغیب
  اے تو غائب ز نظر، مہرِ تو ایمانِ من ست
  [غیب پر ایمان رکھنا، ایمان کی شرط ہے
  اے میری نظروں سے اوجھل (رہنے والے)، تیری محبت میرا ایمان ہے]
- انّا للّٰہِ وَ انّا الیہِ رَاجعُوْنَ۔
  [بے شک ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔]
  یہ آیت مصیبت یا کسی کی موت کی خبر سن کر پڑھتے ہیں۔

(خط بہ نام علاء الدین خاں علائی)

- آں چہ ما درکار داریم اکثرے درکار نیست
  [جو کچھ ہمیں مطلوب ہے، اکثر نہیں ملتا۔]
- لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوم
  [کس کا راج ہے اُس دن؟]
- لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَھَّار
  [اللہ کا ہے جو اکیلا ہے دباؤ والا]
  [پارہ۔۲۴، سورۃ المومن، آیت نمبر۔۱۶]
- فرخ آں روز کہ از خانۂ زنداں بروم
  سوئے شہرِ خود ازیں وادیِ ویراں بروم
  [خوشا وہ دن کہ میں قید خانے سے آزاد ہو جاؤں
  (اور) اس ویرانے سے اپنے شہر کی جانب جاؤں]

آپ نے پڑھا

- غالب کی شاعری کے ساتھ اُن کے اردو خطوط کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ اُن کی شاعری کی اہمیت اپنی جگہ لیکن وہ اردو کے صاحبِ طرز نثر نگار اور بے مثل مکتوب نگار بھی ہیں۔
- غالب نے خود کہا: ''میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بدزبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو'' (خط بہ نام حاتم علی مہر)۔ غالب کی مکتوب نویسی کا یہ بڑا کمال ہے کہ انھوں نے دو لوگوں کے بیچ مراسلے کو گفتگو بنا دیا جیسے دونوں آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے سے محوِ گفتگو ہیں۔
- غالب نے کہا: ''میں نے آئینِ نامہ نگاری چھوڑ کر مطلب نویسی پر مدار رکھا ہے۔ جب مطلب ضروری التحریر نہ ہو تو کیا لکھوں'' (خط بہ نام قاضی عبدالجمیل جنوں)۔ غالب نے رسمی انداز کی باتوں یا تکلفانہ ماحول کے لیے خطوط میں زیادہ گنجایش قائم نہیں ہونے دی۔ کام کی باتوں کو سادہ، صاف اور عام فہم انداز میں لکھ دیا جائے، یہی خطوط نویسی کا مقصد ہے اور غالب اسی اظہارِ واقعی کو اہمیت دیتے ہیں۔
- غالب نے ایک جگہ لکھا: ''پیر و مرشد! یہ خط نہیں لکھتا ہے، باتیں کرتی ہیں اور یہی سبب ہے کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا۔'' (خط بہ نام نواب انوار الدولہ شفق)۔ ایک فارسی خط میں کہتے ہیں: ''مکتوب الیہ کو اس کی حیثیت کے مطابق پکارتا ہوں۔ القاب اور آداب اور عافیت حشو زائد ہے'' (پنج آہنگ)۔ غالب اپنے خطوط میں غیر ضروری القاب و آداب یا تکلفات سے پرہیز کرتے ہیں اور اپنے ڈھالے اور بنائے القاب، مقدور بھر اختصار کے ساتھ استعمال میں لاتے ہیں۔ اسی لیے وہ القاب یا آداب عمومی کے بجائے خصوصی ہو جاتے ہیں۔
- غالب کو اُن کے سوانح نگار حالی نے ''حیوانِ ظریف'' کہا ہے۔ ظرافت، ہنسی، مذاق، ٹھٹھول غالب کے مزاج کے غالب عناصر ہیں۔ اپنی بے چارگی، کسمپرسی اور بے سروسامانی پر بھی ہنسنے ہنسانے کے مواقع ڈھونڈ لیتے ہیں۔ اُن کے خطوط اُن کی شخصیت اور اندازِ تحریر کی ان خصوصیات سے مالا مال ہیں۔
- غالب نے اپنی عمر کی آخری دو دہائیوں میں اردو مکتوب نویسی کی طرف توجہ کی۔ خاص طور سے غدر کے دوران اور اس کے بعد اُنھوں نے بڑی تعداد میں اپنے شاگردوں، اعزا اور احباب کو اردو خطوط روانہ کیے۔ اس زمانے میں وہ شدید طور پر تنہا اور اکیلے ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے خود لکھا: ''میں اس تنہائی میں صرف خطوط کے بھروسے پر جیتا ہوں'' (خط بہ نام مرزا ہرگوپال تفتہ)۔ اس طرح خود غالب کی بے بسی اور ایامِ غدر کے حالات ان خطوط میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں جن سے یہ خطوط دستاویزی اہمیت حاصل کر لیتے ہیں۔
- غالب کی شخصیت کی رنگا رنگی اور بوقلمونی اور اُن کے عہد کے زندہ جاوید مرقعے خطوطِ غالب میں بکھرے پڑے ہیں۔

کچھ اور باتیں [مکتوب الیہ کے بارے میں]

- میر مہدی مجروحؔ ولد میر حسین نگار 1833ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کی زندگی بہت افراتفری اور بے امانی میں گزری۔ وہ نائب تحصیل دار، تحصیل دار اور شہر کوتوال کے عہدے پر مامور ہوئے لیکن پانی پت سے دہلی، دہلی سے جے پور اور پھر دہلی سے رام پور مسلسل ہجرت اور نقلِ مکانی میں رہے۔ اخیر عمر میں نواب حامد علی خاں کی قدر دانی کے سبب تھوڑی فراغت نصیب ہوئی۔ 15 مئی 1903ء کو اُن کی موت ہوئی۔

  وہ غالب کے محبوب شاگردوں میں تھے۔ غالب نے اُن کے نام بڑی تعداد میں خطوط لکھے۔ مطبوعات میں "مظہرِ معانی"، "انوارالاعجاز" (نثر) اور "ہدایۃ الائمہ" (نثر) شامل ہیں۔ غالب کی وفات پر اُن کا شخصی مرثیہ یادگار ہے۔

- منشی ہرگوپال تفتہؔ ولد موتی لال 1799ء میں سکندر آباد (ضلع بلند شہر) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ فارسی کا شوق شروع سے تھا۔ وہ وکالت کے علاوہ کئی ملازمتوں سے منسلک رہے لیکن طبیعت کہیں نہیں لگی۔ 2 ستمبر 1879ء کو سکندر آباد میں وفات پائی۔ تفتہ ابتدا میں راقم تخلص کرتے تھے۔ جب غالب کی شاگردی اختیار کی تو مرزا تفتہ ہو گئے۔ وہ غالب کے دل پسند شاگردوں میں تھے۔ اُن کی شاعری کا بیش تر حصہ فارسی زبان میں ہے۔ ان کے چار دیوان یادگار ہیں۔ اس کے علاوہ ایک طویل مثنوی "سنبلستان" اور 222 اشعار کا ایک مرثیہ ملتا ہے جو تفتہ نے اپنے بیٹے پیتمبر سنگھ کی وفات پر لکھا تھا۔

- نواب علاء الدین خاں علائیؔ ولد نواب امین الدین احمد خاں 25 اپریل 1833ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کی تعلیم کی ابتدا غالب کی نگرانی میں ہوئی۔ غالب کے عزیزوں میں تھے اور اُن کی اہلیہ کے قریبی رشتے دار بھی تھے۔ اردو اور فارسی دونوں میں اشعار کہتے تھے۔ لیکن فارسی سے زیادہ رغبت کے سبب کلام کا بیش تر حصہ فارسی میں ہی ہے۔ علائی کو شطرنج کے کھیل سے خاص شغف تھا۔ جس کے لیے اُنھوں نے ایک شطرنج سوسائٹی کی بنیاد ڈالی تھی۔ اُس میں اس وقت کے بڑے بڑے اُدبا، شعرا اور انگریز منصب دار شامل تھے۔ علائی کی وفات 31 اکتوبر 1884ء کو ہوئی۔

خط نمبر-۱ بہ نام میر مہدی مجروح

- اس خط کا بڑا حصہ میر مہدی مجروحؔ کی شکایت کے جواب میں صرف ہوا ہے جہاں غالب اپنے مخصوص آدابِ مکتوب نگاری کی وضاحت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ "کام کی باتوں" یا "ضروری باتوں" کی مرکزیت یہاں بھی قائم ہے۔ وہ کہتے ہیں: "ہر ضروری کو لکھ لیا، زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا۔" غالب اسی اصول کی یہاں وضاحت کرتے نظر آتے ہیں۔

- "لفافے کُرید اکرو" یا "مسودے کے کاغذ کو بار بار دیکھا کرو" جیسے فقروں سے غالب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان لفظوں کے اندر بھی بعض گہرے معنی موجود ہیں۔ غالب مجروح کی شکایت کا مذاق کی صورت میں جواب

دیتے ہیں اور مختلف انداز اور اسلوب اختیار کر کے مفہوم سے خالی یا خط کے مضمون سے الگ بہت سارے فقروں کو جمع کر دیتے ہیں۔

- خط کو ختم کرتے وقت غالب غدر کے بعد کی تباہیوں کو یاد کرتے ہوئے نہایت طنزیہ لہجہ اختیار کرتے ہیں۔ ابتری پھیلانے والی اشیا، اوزاروں یا احوالِ ناگفتہ بہ کے نہیں ہونے سے ''شہر چپ چاپ'' مراد لیتے ہیں لیکن ان اطلاعات کا آخری سرا وہ اس جملے پر ختم کرتے ہیں: ''دلّی شہر خموشاں ہے''۔ یعنی دلّی شہر نہیں، آدمیوں کے رہنے کی جگہ نہیں، ایک قبرستان ہے۔ ہمیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ کب بے تکلفانہ گفتگو ایک آن میں اس قدر سنجیدہ اور لمناک ہوگئی اور ہم حیران و ششدر رہ جاتے ہیں۔ میر نے بھی غالب کے ایک سو سال پہلے کی دہلی کے احوال پر اسی انداز میں خامہ فرسائی کی تھی:

- دلّی کے نہ تھے کوچے، اوراقِ مصوّر تھے — جو شکل نظر آئی ، تصویر نظر آئی
- ہے سرا و مکاں و جا خالی — یار سب کوچ کر گئے شاید

مذکورہ خط میں غالب نے اپنے ایک خورد کو مخاطب کیا ہے۔ غالب کے یہاں خوردوں سے گفتگو کے دوران یہ تکلف انداز اور غیر ضروری سنجیدگی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں اور بات بات میں کام کی باتوں کا سلسلہ قائم کر دیتے ہیں۔

آپ بتائیے

1- غالب نے کس کو کہا کہ تم میرے ہم عمر نہیں ہو؟
2- میر مہدی مجروح کی تاریخ پیدائش اور مقام پیدائش لکھیے؟
3- حالی کے علاوہ کسی دوسرے شاگرد نے بھی کیا غالب کا مرثیہ لکھا تھا؟
4- میر مہدی مجروح کی وفات کب ہوئی؟
5- غالب نے اردو خطوط، زندگی کے آغاز میں لکھے یا آخری زمانے میں؟
6- غالب نے کن کن زبانوں میں شاعری کی؟
7- غالب کے خطوط کے دو مجموعوں کے نام بتائیں؟

- چاہِ بے آب، ابرِ بے باراں، نخلِ بے میوہ، نثرِ فارسی، امرِ ضروری، غسلِ صحت

ہر جگہ زیر کی اضافت کا استعمال کیا گیا ہے۔ دو لفظوں کے بیچ اضافت کے استعمال سے ترکیب بنائی جاتی ہے۔ یہاں یہ اضافت یعنی زیر 'کا'، 'کی'، 'کے' کے معنوں میں مستعمل ہے۔

مختصر گفتگو

1- غالبؔ نے نامہ نگاری کا کون سا نیا آئین بنایا؟ آپ اس کی پانچ خصوصیات واضح کیجیے۔
2- غالبؔ کی حیات سے متعلق دس جملے لکھیے۔
3- غالبؔ نے مکتوب نگاری کے لیے کون سے عناصر لازمی قرار دیے ہیں؟
4- غالبؔ نے دلّی کو "معبرِ خموشاں" کیوں کہا ہے؟

تفصیلی گفتگو

1- غالبؔ کے خطوط سے ان کی زندگی کے کس پہلو پر روشنی پڑتی ہے؟
2- غالبؔ کے خطوط ان کی زندگی کا آئینہ ہیں، واضح کیجیے۔
3- 'غالب بہ حیثیتِ مکتوب نگار' عنوان سے دو سو الفاظ میں ایک مضمون لکھیے۔

آیئے، کچھ کریں

1- غالب کے خطوط کو پڑھنے کے بعد آپ اپنے تاثرات خود انھیں مخاطب کرتے ہوئے قلم بند کیجیے۔
2- نصابی کتاب میں شامل تین خطوط سے الگ غالبؔ کے خطوط مختلف کتابوں سے تلاش کر کے ان میں سے پسندیدہ خطوط اپنی کاپی میں لکھیے۔

خط نمبر-۲ بہ نام ہرگوپال تفتہ

- اس خط سے غالبؔ کی مایوسی جھلکتی ہے۔ اپنی کسمپرسی، بے بسی اور لاچاری پر وہ ماتم کناں ہیں۔ اس احساس کو وہ مختلف انداز و اسلوب میں کاغذ پر اُتارتے ہیں۔
- غدر کے ہنگامے کے دوران غالبؔ نے یہ مکتوب روانہ کیا ہے، اس لیے خط کے آخری حصے میں تباہی اور بربادی کے واقعات اپنے آپ شاملِ متن ہو گئے ہیں۔
- غالبؔ اپنے ناگفتہ بہ حالات کے بیان میں طنزیہ رُخ اپناتے ہیں۔ مرزا تفتہ سے اُن کی شخصیت اور شاعری کی تعریف کرنے کے بعد اپنے دگرگوں حالات کی طرف اشارہ کیے بغیر وہ نہیں رہ پاتے۔
- غالبؔ کے طنزیہ انداز کا یہ عروج ہے کہ انھوں نے بتایا کہ وہ اپنے تمام اشعار بھول چکے ہیں، بس ڈیڑھ اشعار یاد رہ گئے ہیں۔ غالبؔ جب ایک مصرع اور ایک شعر، جو اُن کے قول کے مطابق انھیں یاد ہیں، پیش کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ غم انگیز اشعار ہیں اور زندگی کی بے چارگی اور موت کے انتظار سے عبارت ہیں۔ اس سے یہ واضح ہوتا

ہے کہ غالبؔ نے اپنے حالات سے تنگ آ کر یہ بات لکھی ہے ورنہ انھیں تو واقعی ہزاروں اشعار یاد ہوں گے۔

- غالبؔ کے طنزیہ اسلوب کا نمونہ اُن کی شاعری میں بھی ملتا ہے۔ وہ شعر گوئی کو وجہِ افتخار نہیں سمجھتے۔ کہتے ہیں:

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری　　کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

یہاں بھی یہ بات ہرگز نہیں کہ وہ شاعری کو دوسرے درجے کی شے سمجھتے ہیں بلکہ اصل طنز ہے کیوں کہ بہترین شاعری کے باوجود انھیں زمانے نے وہ عزت نہیں دی جس کے وہ حق دار تھے۔ اس لیے وہ بار بار اظہارِ بے اطمینانی کرتے ہیں۔ اس خط میں بھی ابتدائی حصّے میں یہی رویہ ہے۔

- یہ خط ایامِ غدر کے بیچ لکھا گیا ہے۔ اس لیے اس میں اس عہد کے چند حقیقی کردار مندرج ہو گئے ہیں۔ غدر کے دوران انگریز بھی لڑائی میں مارے جا رہے تھے۔ غالبؔ ان کے لیے بھی ماتم کر رہے ہیں لیکن اسی کے ساتھ دوسرے ہزاروں کی موت کا بھی انھیں غم ہے۔ ان سب کا ذکر کرتے ہوئے اختتامی کلمے کے طور پر وہ جملہ رقم کرتے ہیں جو نہ صرف غدر کا آئینہ ہے بلکہ غالبؔ کے حالات کا بھی مکمل آئینہ بن گیا ہے۔ "ہائے اتنے یار مرے کہ جو اَب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا"۔ غالبؔ کا یہ مشاہدہ خون کے آنسو رُلاتا ہے۔

آپ بتائیے

1- غالبؔ نے اردو خطوط نویسی کیا 1857ء کے بعد شروع کی؟
2- غالبؔ کس شہر میں پیدا ہوئے؟
3- غدر کس تاریخ کو اور کس شہر سے شروع ہوا؟
4- غالبؔ کا جب دل گھبراتا تھا تب وہ اپنا کون سا مقطع بار بار پڑھتے تھے؟
5- منشی ہرگوپال تفتہؔ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

مختصر گفتگو

1- غالبؔ نے جو اپنا فارسی شعر نقل کیا ہے، اس کا ترجمہ پیش کیجیے؟
2- غالبؔ نے اس خط میں اپنے جو ڈیڑھ اشعار درج کیے ہیں، اُن کی تشریح کیجیے؟
3- تفتہؔ کی کن خوبیوں کی طرف غالبؔ نے اشارہ کیا ہے؟
4- غالبؔ پہلے مرنا کیوں پسند کرتے ہیں؟
5- اس خط میں غالب کس کا ماتم کر رہے ہیں اور کیوں؟
6- غالبؔ کس طرح اپنے شاگردوں کو اپنے خطوط میں مخاطب کرتے ہیں؟ واضح کریں۔

تفصیلی گفتگو

1- خطوط نویسی میں مرزا غالبؔ کا انداز دوسروں سے مختلف ہے، بتائیے۔
2- غالبؔ اور نقشہ کے مابین تعلقات پر ایک نوٹ قلم بند کیجیے۔
3- غالبؔ کے ایسے دوسرے مکاتیب تلاش کیجیے جن میں غدر کے سلسلے سے تباہیوں کا ذکر ہو۔
4- غالبؔ کی حیات اور تصنیفات کے حوالے سے ایک تفصیلی مضمون قلم بند کیجیے۔

خط نمبر-۳ بہ نام علاء الدین خاں علائی

- غالبؔ کا یہ خط اپنے اسلوب اور موضوع دونوں اعتبار سے بہت یادگار ہے۔ اس میں ایک ساتھ استعاراتی اور طنزیہ دونوں اسالیب مل گئے ہیں۔ کبھی کبھی اس خط کے بعض حصّے پر تمثیلی رنگ غالب آتا ہے۔ اس خط کا ڈرامائی انداز تاثر آفرینی میں اضافہ کرتا ہے۔
- غالبؔ نے اپنے خط میں جیل کے مناظر پیش کیے ہیں اور اس کے تمام متعلقہ امور اس میں درج کیے گئے ہیں لیکن یہ کسی جیل کا واقعہ نہیں ہے۔ اصل میں وہ اپنی پیدائش، شادی اور زندگی کے حالات پیش کر رہے ہیں۔
- انھوں نے عالمِ ارواح اور عالمِ آب و گل کی اصطلاحیں استعمال کر کے یہ بتایا ہے کہ عام طور پر دنیا کے گنہ گار کو آخرت میں سزا دینے کا سلسلہ ہے لیکن کبھی کبھی اس کا الٹا بھی ہوتا ہے کہ آخرت کے گنہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ یہیں وہ اپنی پیدائش اور حیات کی دیگر سرگرمیوں کا حال درج کرتے ہیں۔
- غالبؔ نے بتایا کہ مقدمے کی پیشی و روبہ کاری کے لیے آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ کو یہاں بھیجا گیا۔ یعنی اس تاریخ کو غالبؔ پیدا ہوئے۔ تیرہ برس حوالات میں رہے اور ۱۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو حکمِ دوامِ حبس صادر ہوا۔ یہ غالب کی شادی کی تاریخ ہے۔ بیڑی کا پانو میں پڑنا بیوی کا زندگی میں آنا ہے۔ دلّی شہر کو زنداں مقرر کر کے اس میں ڈالنے کا مطلب اس شہر میں بس جانا ہے۔ فکرِ نظم و نثر کو مشقت ٹھہرانے کا مطلب یہ ہے کہ انھیں قیدِ بامشقت ملی ہوئی ہے۔ شعر گوئی اور نثر نگاری اب پوری زندگی کا کام ہے۔
- غالبؔ نے آگے لکھا کہ جیل خانے سے بھاگا اور تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ یعنی وہ کلکتے گئے اور پھر وہاں سے دوبارہ پکڑ کر اُسی جیل خانے میں بٹھانے سے مراد دہلی واپسی ہے۔ دو ہتھکڑیاں اور بڑھانے کا مطلب اولاد اور اعزا کی پرورش ہے۔ اسی طرح پھر بھاگنے کا مطلب دوسرے سفر پر نکلنا ہے۔ حکمِ رہائی سے مطلب ہے موت اور وہ اس کے انتظار میں ہیں۔ آخرت کو وہ اپنا حقیقی گھر سمجھتے ہیں۔
- اس خط سے غالب کی تمام زندگی، اس کی بے چارگی اور بے بسی سب آئینہ ہیں۔ اس کا غیر رسمی اور

بعض اوقات سفاکانہ انداز آخر آخر غم ناکی کے انجام تک ہمیں پہنچ دیتا ہے جب وہ اپنی موت کی ایک متوقع تاریخ بھی پیش کرنے سے باز نہیں آتے۔ حالاں کہ غالب کی کوشش یہی رہتی ہے کہ ایک ظریفانہ ماحول میں ہی سب کچھ چلتا رہے۔

آپ بتائیے

1- غالبؔ کا سنہ ولادت بتائیے۔
2- غالبؔ نے ثمرِ نورس کس کو کہا ہے؟
3- عالمِ ارواح اور عالمِ آب و گل سے کیا مراد ہے؟
4- غالبؔ روبہ کاری کے واسطے کب بھیجے گئے؟
5- نواب علاء الدین خاں علائی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
6- غالبؔ کی ابتدائی تعلیم کس کی نگرانی میں ہوئی؟

نثر میں قافیہ پیمائی

❑ غالبؔ نثرِ مرصّع کی روایت سے الگ ہو رہے تھے لیکن اُن کے ہاں بھی نثر میں قافیہ پیمائی جگہ جگہ مل جاتی ہے۔ اس خط میں بھی ایسے ٹکڑے بار بار آتے ہیں۔ جیسے مجبور، معذور۔ اس طرح غالبؔ کے دوسرے خطوط سے تلاش کر کے نثر میں آزمائے گئے پانچ قافیوں کی نشان دہی کیجیے۔

مختصر گفتگو

1- قرآنی آیات کے دو مختصر ٹکڑے غالبؔ نے اپنے خط میں درج کیے ہیں۔ ان کا اردو ترجمہ بتائیے۔
2- فارسی کے ڈیڑھ اشعار اس خط میں شامل ہیں، اُن کا ترجمہ کیجیے۔

تفصیلی گفتگو

1- غالبؔ نے آخر کن حالات میں اپنی زندگی کو جیل خانے سے مماثل قرار دیا ہے؟ وضاحت کیجیے۔
2- غالبؔ کے حالاتِ زندگی تفصیل سے معلوم کیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1- آپ غالب کو مخاطب کر کے ایک خط لکھیں جس میں غالبؔ کا انداز و اسلوب موجود ہو۔
2- خطوطِ غالب کے کسی مجموعے سے اپنی پسند کے پانچ خطوط تلاش کیجیے۔

اشفاق اللہ خاں

اشفاق اللہ خاں 22 اکتوبر 1900ء کو شاہ جہاں پور (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد شفیق اللہ خاں محکمۂ پولس میں انسپکٹر تھے جن کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا۔ والدہ مظہر النسا نے دوسرے تین بیٹوں کے ساتھ ان کی پرورش کی۔ وہ پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ دینی کتابوں کے علاوہ اخبارات ورسائل کے مطالعے کا بھی انھیں شوق تھا۔ اشفاق نے کم عمری میں ہی شاعری شروع کر دی اور حسرت تخلص اختیار کیا۔ ایک نامکمل خود نوشت سوانح اور تاریخی اہمیت کے چند خطوط نثر میں ان سے یادگار ہیں۔

تیرہ چودہ برس کی عمر سے انھوں نے گردوپیش میں ہونے والے واقعات اور ملکی حالات سے اثر لینا شروع کر دیا۔ دہلی میں وائسراے کی سواری پر ایک انقلابی کے بم مارنے کے واقعے اور مین پوری ڈکیتی کیس (1911ء) میں ماخوذ ملزموں کی قوم پرستی اور حریت پسندی سے وہ حد درجہ متاثر ہوئے۔ ان کے اندر انگریزوں سے نفرت اور خدمتِ وطن کی چنگاری بھڑکی۔ زمانۂ طالب علمی میں والٹر اسکاٹ کی نظم Love for Country پڑھنے کے بعد اُن میں وطن پر جاں نثاری کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ ان کے مطالعے میں آنے والی ایک انگریزی کتاب "Patriots of the World" نے اسی چنگاری میں ہوا کا کام کیا اور اب ان کی شخصیت شعلہ بن چکی تھی۔

آٹھویں جماعت کے بعد اسکول کی تعلیم کو اشفاق اللہ خاں نے خیر باد کہا اور 21-1920ء کے زمانے میں بنارسی لال اور پنڈت رام پرشاد بسمل جیسے انقلابیوں کی صحبتوں میں شامل ہوئے۔ ان اصحاب کے افکار واعمال نے ہی ان کے وطن کے لیے جاں نثاری کا جذبہ پیدا کیا۔ اسی زمانے میں اشفاق اللہ انڈین ری پبلکن ایسوسی ایشن نامی ایک خفیہ انقلابی جماعت میں شامل ہوئے جس کا مقصد ہندستان میں ایک آزاد جمہوریے کا قیام تھا۔ یہ جماعت کانگریس پارٹی کی پُر امن اور آئینی انداز میں کی جانے والی سیاسی تحریک سے متفق نہیں تھی۔ وہ انگریزی حکومت کے خلاف تشدد کے ساتھ کچھ کر گزرنے کے لیے بے چین تھی۔ اس نے اپنی انقلابی مہم کو مستحکم کرنے کے لیے فنڈ کی فراہمی کی خاطر سرکاری خزانے کو لوٹنے کا بھی فیصلہ کیا۔

19 اگست 1925ء کی شب کو جب سرکاری خزانے کو لے کر ایک ٹرین سہارن پور سے لکھنؤ جاتے ہوئے کاکوری پہنچی تو اشفاق اللہ اور ان کے نو ساتھیوں نے اس پر دھاوا بول دیا اور خزانے کو لوٹ لیا۔ پورے ملک میں سنسنی پھیل گئی۔ حکومت کی مشنری حرکت میں آئی اور اُن کے پیچھے ساتھی گرفتار کر لیے گئے۔ اشفاق اللہ بھاگل پور، ہزاری باغ اور ڈالٹین گنج میں سال بھر تک روپوش رہے۔ آخر کار ستمبر 1926ء دہلی میں انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ حکومت نے مقدمہ چلایا اور 19 دسمبر 1927ء کو انھیں پھانسی دی گئی۔

ہندستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں اشفاق اللہ کا شمار صفِ اوّل کے مجاہدوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے وطن پر جاں نثاری کی جو مثال قائم کی، وہ گراں قدر ہے۔ اُن کا نام بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد کی صف میں لیا جاتا ہے۔

اشفاق اللہ خاں (شہید)

جیل سے والدہ کے نام خط

از زندانِ فیض آباد (پھانسی کی کوٹھری) 15 دسمبر 1927ء

دکھیا اور بوڑھی ماں کی خدمت میں اس کے مرتے ہوئے فرزند کا سلام پہنچے جو اسی ہفتے میں اس فانی دنیا کو الوداع کہہ کر اس ملکِ جاودانی کو جائے گا جہاں اس سے پہلے بھی سب جا چکے ہیں اور ہر ذی روح مستقبل میں بھی جائے گا۔

فنا ہے سب کے لیے ہم پہ کچھ نہیں موقوف
بقا ہے ایک فقط ذاتِ کبریا کے لیے

اس حقیقت سے آپ بھی بہ خوبی واقف ہیں اور تعلیم یافتہ ہیں مگر یہ ضرور ہے کہ بوڑھی، سن رسیدہ، دکھیا ماں کے لیے یہ صدمہ بہت بڑا ہے کہ اس کا جوان بیٹا نامراد دنیا سے اُٹھ جائے اور وہ اس کی نعش پر دو آنسو بھی نہ ڈال سکے یا اس کی مَری ہوئی صورت دیکھ سکے۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ یہ حکم کس کا ہے؟ کیا دنیا کے کسی انسان کا حکم ہے؟ کیا کوئی مجھے اس کے حکم کے بغیر مار سکتا ہے؟ اس نے روزِ ازل سے ایسا ہی لکھا تھا کہ اشفاق تجھ کو پھانسی پر مرنا ہے اور جب تو مَرے گا تو کوئی تیرے اعزا واقربا اور احباب میں سے نہ ہوگا۔ پس حکمِ خداوندی پورا ہو کر رہے گا اور ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔

میں یہ لکھ دینا چاہتا ہوں کہ میں بہ اطمینان اور پُرسکون موت مر رہا ہوں۔ حکمِ خدا ایسا ہی تھا اور وہ اٹل ہے اور وہ ہو کر رہے گا۔ موت سب کے لیے ہے اور سب مریں گے۔ دنیاوی تکالیف، مادّی بندشیں اور انسانی قیود سب پیر کے روز ختم

ہو جائیں گی اور میری روح اس قفسِ عنصری سے آزاد ہو جائے گی اور اب دوسری منزل سامنے ہے، دیکھیے وہاں کیسی گزرے۔ یہ اس کی بخشش و کرم پر منحصر ہے۔ سفر درپیش ہے، زادِ راہ پاس نہیں۔ بس اسی کے کرم کی امید پر خوش خوش جا رہا ہوں۔ میں آپ سب کو الوداع کہتا ہوا اور خصوصاً آپ کو بقیہ زندگی میں وقفِ نوحہ و بکا کر کے اس طرف جا رہا ہوں جہاں سے آیا تھا اور پھر واپس جانے کا ارادہ تھا۔ وعدہ پورا کرتا ہے۔

آپ سب کے سامنے راہِ عمل کیا ہے؟ میں نے بُرا کیا یا اچھا؟ میں اقرار کرتا ہوں کہ میری زندگی کے اتنے برس گمراہی، معصیت، سیاہ کاری اور گناہوں میں گزرے۔ اس کے لیے میرے دوست، میرے عزیز و اقارب، میرے بھائی اور مختصر یہ کہ ہر ہمدرد مسلمان دعائے مغفرت کرے اور آپ سب لوگ صبر کیجیے۔ صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد!

مجھے ڈر ہے کہ آپ گھبرا نہ جائیں اور یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ جس کی جوان اولاد مر جائے، وہ کیسے صبر کر لے؟ تو سنیے، میری پیاری ماں! خدا نے مجھے آپ کے شکم سے پیدا کیا تھا۔ میری پیدائش پر خوشیاں منائی گئی تھیں، شکرانے ادا کیے گئے تھے اور قصہ مختصر یہ کہ مجھ کو آنکھوں کا نور اور دل کا سرور سمجھا جاتا تھا۔ آپ نے اس صلے میں خدا کو کیا دیا؟ اس نے آپ کو ایک انسان کی شکل میں اولاد دی۔ آپ سے جو بھی پوچھتا تھا، آپ یہی کہتی تھیں کہ خدا کا بندہ ہے، خدا نے دیا ہے، اسی کی امانت ہے اور میں امانت دار ہوں۔ پس اب مالک اپنے غلام کو طلب کرتا ہے۔ امانت رکھنے والا اپنی امانت طلب کرتا ہے، آپ خیانت نہ کریں۔ نہ آپ کی چیز تھی، نہ آپ سے چھینی گئی۔ اتنے دن کے واسطے آپ کو دی گئی تھی کہ رکھو، بعد کو ہم واپس لیں گے۔ اب واپس لیے جا رہا ہوں۔ پھر آپ کو کیا حق ہے کہ ردوقدح کریں؟

کیا آپ نے یہ سوچا تھا کہ مجھے موت کبھی نہ آئے گی؟ تم بھی جانتی تھیں اور مجھے بھی معلوم تھا کہ ہم تم سب مریں گے، کوئی آگے، کوئی پیچھے۔ یا تو مجھ کو رونا پڑتا تمھارے لیے یا تمھیں میرے لیے۔ لیکن اس کا منشا یہ ہے کہ بوڑھی ماں جوان اولاد کے لیے روئے گی اور بقیہ تین بھائی اپنے چھوٹے بھائی کا ماتم کریں گے۔ تو کیا آج اس دنیا میں کوئی اتنا طاقت والا ہے کہ اس خداوندِ قدوس کے احکام کو پلٹ دے؟ کوئی نہیں! اپنے خاندان ہی میں کتنی ایسی مائیں ہیں جو بڑھاپے میں جوان اولاد کا داغ کھائے بیٹھی ہیں اور کتنے ہی ایسے بھائی ہیں جو اپنی آنکھیں اپنے بھائی کے لیے سرخ کر چکے ہیں اور کتنی ہی بھاوجیں، بھتیجیاں، بھتیجے، بھانجیاں، بھانجے ہیں جو کہ اپنے بھائی، دیور، چچا اور ماموں کے لیے سینہ کوبی کر چکے ہیں۔

دنیا کا یہی دھندا ہے، دنیا نام ہی اسی کا ہے۔ اگر مرنا نہ ہوتا تو زندگی کا فائدہ ہی کیا تھا۔ اگر رات نہ ہوتی تو دن میں لذت ہی کیا ہوتی؟ اگر غم نہ ہو تو شادی بمنزلہ غم ہے۔ غرض کہ دنیا ایک معجونِ مرکب ہے، جس میں سب ذائقے ہیں۔ عیش و مسرت، غم و اندوہ، آرام و تکلیف، غفلت و بیداری، نیکی و بدی، موت و زیست، غرض ہر چیز یہاں ملے گی۔ پس خوش قسمت ہے وہ جس نے اچھی باتیں قبول کیں اور بُرائیوں سے پرہیز کیا، غفلت پر ہوشیاری کو ترجیح دی اور معبودِ حقیقی کی یاد میں دل لگایا اور ہوشیار رہا۔ اپنے فرائض کی ادائیگی میں نیکی کو قبول کیا اور بدی کو ٹھکرا دیا۔ ابدی آرام کی خاطر نفس پر تکلیف

برداشت کی اور عبادت میں مصروف رہا۔ موت کو پیشِ نظر رکھا اور زیست ہی میں سامانِ آخرت کو جمع کر لیا۔ عیش و مسرت میں پڑ کر غفلت نہیں کی اور پیش آنے والے غم واندوہ کا کھٹکا محسوس کرتا رہا۔

پس جس نے ان باتوں کو اختیار کیا اور مصیبت و آرام کو من جانب اللہ تصوّر کیا اور اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کیا، مصائب و تکالیف پر صبر کیا اور کہا کہ یہ سب من جانب اللہ ہیں اور ع ہر چہ از دوست می رسد نیکو است

دوست کا دیا ہوا زہر ہلاہل بھی شہدِ مصفا خیال کیا اور صبر کیا، شکر کیا۔ پس اسے راضی کر لیا جو کونین کا مالک اور مشرق و مغرب کا رب ہے۔ کیا تم اس کی خواہش مند نہیں ہو کہ خدا جو تمھارا پیدا کرنے والا ہے اور جس کے سامنے تمھیں جانا ہے، اپنا دوست کہہ کر پکارے؟ دنیا اس کی متمنی ہے کہ وہ اپنا دوست کہے۔

آج موت کے سامنے بیٹھا ہوا اشفاق کچھ خواہش نہیں رکھتا۔ مگر ہاں! وہ کہہ دیں کہ ''اشفاق میں تجھ سے راضی ہوں، تو میرا بندہ ہے اور میں نے تیری بندگی کو قبول کر لیا ہے۔'' وہ کہتا ہے: ''اے ایمان والو! مدد مانگو صبر اور نماز سے۔ بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے!'' (سورۂ بقرہ: ۱۵۳) دوسری جگہ فرماتا ہے: ''(خوش خبری سنا دو، ان صبر کرنے والوں کو)، جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی کے ہیں اور بے شک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔'' (ایضاً ۵۶-۵۵) پھر فرماتا ہے: ''یہی ہیں جن پر برکات ہیں ان کے رب کی طرف سے اور رحمت ہے۔ یہی لوگ ہدایت والے ہیں، ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔''

یہ قول آپ کو جنابِ باری تعالیٰ کے لکھ دیتے ہیں۔ اب سمجھنا آپ کا کام ہے۔ آپ کا صبر و شکر آپ کو اس کے دربار میں مقبول و مقرّب کرے گا اور خدانخواستہ اگر آپ حد سے آگے بڑھ گئیں تو آپ خود سمجھ دار اور پڑھی لکھی ہیں۔ آپ کا نالہ و شیون، آہ و زاری، سینہ کوبی مجھ کو زندہ نہیں کر سکتی۔ نہ موت سے بچا سکتی ہے۔ ہاں صبر کرنا، کلمہ و درود پڑھنا اور بخشنا میرے لیے کچھ سود مند ثابت ہو سکتے ہیں۔

پس میری اچھی ماں! میری خطائیں معاف فرما کر مشغول بہ یادِ خدا ہو جاؤ۔ اس کی مرضی یہی تھی۔ اور کون ہے جو اُس کے حکم کو ٹال سکے؟ میں نے آپ کو دُکھ پہنچایا، آپ کا بُڑھاپا برباد کیا، آپ کی زندگی ضیق میں ہو گئی۔ ہاں! ظاہراً اسباب میں سے ایک میں ہوں۔ مگر مولا کی مرضی اور اس کا حکم ہر بات میں پوشیدہ رہتا ہے۔ سمجھ دار ہر بات کو من جانب اللہ سمجھتے ہیں اور ناسمجھ انسانوں کی طرف خیال دوڑاتے ہیں۔

اس سے قبل ایک کارڈ فیصلے کے متعلق ملا ہوگا۔ کیسے مزے کی بات ہے کہ میں اپنے قلم سے اپنی موت کی خبر آپ کو بھیج رہا ہوں۔ میں نے ایک کتاب لکھنی شروع کی تھی اور وہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ خیر مالک کی مرضی ہی نہ تھی۔ جس میں میرا مقصد بچوں کے لیے نصیحت کرنا تھا۔ خیر! اُن کے لیے جو میدانِ عمل ہے اور جو سامنے آئے اس پر گامزن ہوں۔ مجھے جو لکھنا ہے، تھوڑا تھوڑا سب کو لکھ دوں گا۔ سب اپنا اپنا مطلب نکال لیں۔ مجھے تو سب سے ضروری آپ کو لکھنا تھا اور یوں تو یہ مضمون واحد تصوّر

کیا جائے۔ سکھوں سے صبر کی گزارش ہے۔ صبر ہی خوشی کی کنجی ہے۔ مجھے بوبو کی پریشانیوں کا بھی علم ہے اور آپ سب کی کوفت میں ایسے وقت میں اضافہ غم کا ہے۔ مگر مولا کی مرضی ٹالی جا سکتی ہے؟ نہیں! وہ ہر صورت سے آزمایش کر رہا ہے۔ تم صبر کو ہاتھ سے نکلنے نہ دو۔ جو دوست کی طرف سے خوشی و غم ملے، مسکراتے ہوئے چہرے اور مطمئن دل کے ساتھ قبول کرو کہ فلاح دینی و دنیوی حاصل کر سکو۔ میں کوشش کروں گا کہ یہ خط تم کو میری موت سے پہلے ہی مل جائے تا کہ تمھارے دکھ میں کمی ہو جائے اور تم سوچ سکو کہ مرنے والا، کیا بات ہے کہ مرتے ہوئے بھی مطمئن اور خوش ہے:

فنا ہے سب کے لیے ہم پہ کچھ نہیں موقوف　　بقا ہے ایک فقط ذاتِ کبریا کے لیے

آدم علیہ السلام سے لے کر اس وقت تک کون ایسا ہے جو مَرا نہ ہو۔ جس نے بساطِ عالم پر زندگی کے مُہرے بچھائے، موت کے ہاتھوں ضرور مات کھائی۔ پس اس کا غم بے کار ہے اور آنے والی اور ضرور آنے والی بات کے لیے پریشان ہونا سراسر غلطی ہے۔ اب رہی محبت، ڈاہ، موہ، پریم، یہ سب دنیاوی دھندے ہیں۔ خدا سے محبت کرو، اس کو پوجو جو ہمیشہ زندہ و قائم رہے گا۔ تمھیں اپنی بقیہ زندگی میں کبھی بھی اس کے لیے رونا نہیں پڑے گا۔ بس اسی سے محبت کرو اور اسی کو سمجھو۔ عقلی دلائل، مذہبی مسائل، فلسفیانہ بحث دُکھے ہوئے دل پر نمک مرچ کا کام کرتے ہیں۔

میں خوب جانتا ہوں کہ آپ سوچیں گی کہ میں نے اپنی کرتوتوں سے آپ کا بُڑھاپا خراب کیا اور بھائیوں اور دیگر اعزا کی زندگی دُکھ کی زندگی بنا دی۔ میں نے کیا کیا؟ میں نے کچھ نہیں کیا۔ اس کا حکم روزِ ازل سے ایسا ہی تھا، سو ہو کر رہا۔ جو بات ہونے والی ہوتی ہے، اس کے اسباب پیش تر سے ہونے شروع ہوتے ہیں اور جب اسباب پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں، بات پوری ہو جاتی ہے۔ پس میرے لیے یہ موت کا دن تھا، سو مجھے ملا اور تمھارے لیے دُکھ، بڑھاپے کا دھگا اور سینہ کوبی لکھی تھی، وہ تمھیں مل رہی ہے۔ جو جس کے لیے اُس نے مناسب سمجھا، وہ اسے تقسیم کر دیا۔ پس کون ہے جو شکوہ کرے اور لب شکایت کے واسطے کھولے:

ہم رضا کار ہیں ہم پر ہے بہر حال یہ فرض　　شکرِ حق لب پہ رہے، شکوۂ اعدا نہ کریں
مان لیں فیصلۂ دوست کو بے چون و چرا　　فکرِ امروز ہی رکھیں، غمِ فردا نہ کریں

اس نے تم سب کو غم اٹھانے کے لیے منتخب کیا اور مجھے منصورِ وقت بنانے کے لیے چُن لیا۔ اگر تم کو گریۂ یعقوب عطا کیا تو مجھ کو سنتِ یوسفی ادا کرنے کے لیے پُکارا۔ اگر تم کو ماتم کناں مثلِ خاندانِ نبوی بنانا چاہا، بنا دیا، تو مجھے متبعِ حسین شہیدِ تیغِ جفا کے خطاب سے نوازا۔ اس کی شان نرالی، اس کی ادا انوکھی۔ وہ ہر جگہ نئے رنگ میں، ہر طرف نئے روپ میں جلوہ گر ہے۔ جو کچھ ہُوا، جو ہو گا اور جو کچھ ہو رہا ہے، اسی کی مرضی سے ہو رہا ہے اور ہو گا۔ کون ہے جو سرتابی کرے اور کون ہے جو اُس کے حکم سے باہر جا سکے۔ پس اسی پر نظر رکھو اور صبر و قرار ہاتھ سے نہ جانے دو۔ شکر کرو کہ اس کی امانت اسی کی طرف جا رہی ہے۔ صانع اپنے مصنوع کو بگاڑنا چاہتا ہے۔ پھر تم کون تڑپنے والی ہو۔ اس کی چیز تھی، اسی کو اختیار ہے۔

صبر کرو، صبر، اور بقیہ زندگی کا بیش بہا وقت میرے لیے رونے میں صَرف نہ کرو بلکہ اس سفر کی تیاری میں لگاؤ جو ایک دن درپیش ہے۔ عبادت میں مغفرت ہے۔ گناہوں میں وقت نہ گزارو۔ یہی کام آئے گا، غفلت چھوڑو۔ اب اس کو پکڑو۔ دنیا فنا ہونے والی ہے اور تمھارا بھی بُڑھاپا ہے۔ اچھا، میری خطائیں مُعاف کرو اور مجھے اپنے حقوق سے سبک دوش کرتم کو خدا کی دَین میں دیتا ہوں۔ وہ تمھیں نیک بی بی اور صابرہ بی بی بنائے۔ آمین!

بھاوجو اور بھائیو! الفراق بینی وبینکم! تم آپس میں مل جل کر رہنا اور دکھیا اور بدقسمت ماں کی خدمت میں لگی رہنا اور انھیں بقیہ زندگی کو سکون سے گزارنے کا موقع دینا۔ اگر تم لوگ ایسے ہی آپ میں شکوہ شکایت کرتے رہے اور تمھارے دلوں میں یہ رہی تو پھر کچھ لطف نہیں۔ آپس میں شیر وشکر بن کر رہنا اور جدا نہ ہونا۔ میری تو یہی خواہش ہے اور مجھے معافی دینا، خدا کی مرضی یہی تھی!

بھائیو، تم نے انتہائی کوشش کی لیکن موت اور خدا کا حکم ٹالے نہیں ٹلتا اور پورا ہو کر رہے گا۔ تم بھی مجبور ہو، صبر اور شکر کرنا۔ خدا کی مرضی ہی ایسی تھی۔ میں بتائے دیتا ہوں کہ میں ایک پُرسکون موت مر رہا ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کون سا خیال مجھے مست اور خوش بنائے ہوئے ہے۔ دل اندر سے پھولا چلا آتا ہے۔ مجھے قطعی خیال نہیں گزرتا کہ مجھے پھانسی دی جائے گی۔ مریں گے تو سب ہی، کچھ میں ہی نہیں مر رہا ہوں۔ تم خدا پر نظر رکھو اور بجائے رونے دھونے کے، میرے لیے ایصالِ ثواب میں لگے رہنا۔

زیادہ کیا لکھوں، خدا تم سب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور مجھ گنہ گار بندے کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

فقط

اشفاق اللہ خاں وارثی

لفظ و معنی

مُلکِ جاودانی - ہمیشہ رہنے والا ملک، عاقبت

موقوف - التوا میں، وقف کیا گیا، ملتوی کیا گیا

بقا - ہمیشگی، دوام، پائداری

نعش - لاش، میّت

مادّی - دنیوی، اشیا سے متعلق طبعی، مادّہ سے منسوب

بُکا - گڑگڑانا، رونا، گریہ وزاری

صبر تلخ است ولیکن بَر شیریں دارد - صبر کڑوا ہوتا ہے لیکن اس کا پھل میٹھا ہوتا ہے

ردّوقدح - حجت، بحث، تکرار

قدّوس - مقدّس، پاک، اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام

سینہ کوبی - چھاتی پیٹنا، ماتم کرنا

معجونِ مرکّب - ملا ہوا مقوّی حلوہ، مرکّب دوا جو کئی دواؤں کو ملا کر بنائی گئی ہو

غم واندوہ - رنج والم، غم والم

زیست - زندگی

سامانِ آخرت - خدا کے گھر جانے کی تیاری، نیکی، آخرت کی تیاری

ہر چہ از دوست می رسد نیکو است - دوست سے جو کچھ ملتا ہے، اچھا ہوتا ہے

شہدِ مصفّا - اچھا صاف ستھرا شہد

متمنّی - تمنا رکھنے والا، تمنا کرنے والا، خواہش مند

مُقرّب - قریب کیا گیا، مصاحب، خاص دوست

شیون - نالہ وماتم، آہ وزاری

درود - وہ دعا اور سلام جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑھا جائے

ضیق - تنگی، دشواری

گام زن - چلنے والا، تیز رفتار

کوفت - بے زاری، صدمہ

فلاح - اچھائی، بھلائی

رضا کار - خدمت گار، جس نے اپنی مرضی سے اپنے آپ کو خدمت کے لیے پیش کیا ہو، والنٹیر

بے چون وچرا - بغیر حیلہ وحجت، بغیر کسی عذر کے

امروز - آج

فردا - آنے والا کل

گریۂ یعقوب - حضرت یعقوب علیہ السلام کی آہ وزاری

سنّتِ یوسفی - حضرت یوسف علیہ السلام کی سنّت، حضرت یوسف علیہ السلام کا طریقہ

متبع - پیچھے چلنے والا، پیرو، اتباع کرنے والا

تیغِ جفا - ظلم کی تلوار، ناانصافی کی تلوار

سرتابی - سرکشی، نافرمانی

صانع - بنانے والا

مصنوع - بنایا ہوا، گڑھا ہوا

الفراق بینی وبینکم - اب میرے تمھارے درمیان جدائی ہے (ایک دوسرے سے الگ یا جدا ہوتے وقت بولتے ہیں)

شکر رنجی - معمولی سی رنجش، اَن بَن

ایصالِ ثواب - ثواب بھیجنا

صبرِ جمیل - وہ صبر جس پر ثواب ملتا ہے
جوار - پڑوس، ہمسائگی
جوارِ رحمت - رحمت کا قرب

آپ نے پڑھا

- ماں کے نام لکھا گیا بیٹے اشفاق اللہ خاں کا خط آپ نے پڑھا۔ اس خط میں بیٹے کا فرض اور ماں سے محبت دونوں پہلو اُبھرتے ہیں۔ اشفاق اللہ کسی مورچے پر کمزور نہیں ہیں۔ اشفاق اللہ کے کردار میں بلند ہمتی، حق گوئی، صداقت، ثابت قدمی اور صبر و استقامت کے اوصاف کا پتا چلتا ہے۔
- اشفاق اللہ خاں نے اپنی ماں اور اہلِ خاندان کو ذہنی طور پر ان کی شہادت کے لیے تیار ہونے کی تلقین کی ہے۔ انھوں نے سیاسی سوالات نہیں قائم کیے اور نہ ہی سیاسی تاویلیں پیش کی ہیں بلکہ وہ تہذیبی، ثقافتی، ادبی یا مذہبی منطق پیش کرتے ہوئے ملک و قوم کے لیے شہادت کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہیں۔
- اشفاق اللہ خاں شاعر بھی تھے۔ اس مختصر سے خط میں اچھی خاصی شاعرانہ گفتگو موجود ہے۔

آپ بتائیے

1- اشفاق اللہ خاں کی پیدائش اور موت کی تاریخیں بتائیے۔
2- ان کے والدین کے نام درج کیجیے۔
3- دو انقلابیوں کے نام بتائیے جن سے ان کے تعلقات قائم ہوئے۔
4- سرکاری خزانے کو لوٹنے کے کام میں ان کے ساتھ کتنے ساتھی تھے؟
5- انھوں نے اپنی پھانسی سے کتنے دن پہلے اور کس تاریخ کو اپنی ماں کے نام خط لکھا؟
6- انھوں نے ایک کتاب لکھنی شروع کی تھی۔ کیا وہ تکمیل کو پہنچ سکی؟
7- یہ مکتوب اشفاق اللہ خاں وارثی نے کسے لکھا ہے؟ مکتوب الیہ کا نام بتائیے۔
8- پیشِ نظر خط میں مکتوب نگار نے بہنوں سے کیا گزارش کی ہے؟

درج ذیل لفظوں کے صیغۂ واحد لکھیں

اعزہ..... اقربا..... احباب..... خزائن.....
تکالیف..... قیود..... مصائب..... اعدا.....
برکات..... اسباب..... دلائل..... حقوق.....

مختصر گفتگو

1- خط کی ابتدا میں اشفاق اللہ خاں نے جو شعر درج کیا ہے، اپنے لفظوں میں اس کی تشریح کیجیے۔

2- اپنی والدہ کو صبر کی تلقین کرنے کے پیچھے کون سا مقصد مکتوب نگار کے ذہن میں کارفرما ہے؟

3- موت کی گھڑیاں نزدیک ہونے کے باوجود اشفاق اللہ خوش ہیں۔ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہے؟

4- مذہب اسلام کی تاریخ سے جڑی کچھ اصطلاحیں مکتوب نگار اپنے خط میں استعمال کر رہا ہے۔ جیسے گریۂ یعقوب، سنتِ یوسفی وغیرہ۔ ایسی کچھ دوسری اصطلاحیں اپنی نصابی کتاب سے منتخب کریں اور اُن کی وضاحت کریں۔

5- انھیں پھانسی کی سزا کیوں دی گئی؟

6- ان کے خط سے ان کی شخصیت اور کردار پر کیا روشنی پڑتی ہے؟

تفصیلی گفتگو

1- اشفاق اللہ خاں کو شہیدِ وطن کیوں کہا جاتا ہے؟

2- انھوں نے اپنی ماں کو یہ خط کیوں لکھا؟

3- خط میں پیش کیے گئے اہم نکات کو واضح کیجیے؟

4- ان کے خط میں زندگی اور موت کے بارے میں کن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے؟

5- اس خط کو پڑھ کر آپ کے ذہن میں اشفاق اللہ خاں کی کیسی تصویر ابھرتی ہے؟

6- کیا اشفاق اللہ خاں اور ان کے ساتھیوں نے صحیح کام کیا تھا؟ آپ اپنی دلیل دیجیے۔

7- ہم رضا کار ہیں ہم پر ہے بہر حال یہ فرض — شکرِ حق لب پہ رہے، شکوۂ اعدا نہ کریں
مان لیں فیصلۂ دوست کو بے چون وچرا — فکرِ امروز ہی رکھیں، غمِ فردا نہ کریں

(الف) اس خط میں درج کیے گئے ان اشعار کی تشریح کیجیے۔

(ب) ان اشعار کا اشفاق اللہ خاں کی زندگی سے کیا تعلق ہے؟

آیئے کچھ کریں

1- جنگِ آزادی میں بہت سارے لوگوں نے جیل سے اپنے اعزا و اقربا کو خطوط لکھے جو مختلف ناموں یا عنوانات کے تحت کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ ایسی کتابوں کی ایک فہرست تیار کیجیے اور لائبریری سے انھیں حاصل کر کے ان میں سے پسندیدہ خطوط کی نقل تیار کیجیے۔

2- اس خط کو ڈرامے کی شکل میں منتقل کیجیے اور اسکول کے پروگرام میں اسے اسٹیج کر کے دکھایئے۔

مختصر افسانہ

مختصر افسانے کو زندگی کی ایک قاش کہا گیا ہے۔ قصہ گوئی کی وہ مختصر صورت جس میں زندگی اختصار اور ایجاز کے ساتھ سما جائے، وہ صنف مختصر افسانہ ہے۔ مختصر افسانے کی ایک مشہور تعریف مغرب میں یہ کی گئی کہ وہ تحریری قصہ جسے ایک نشست میں پڑھ لیا جائے، مختصر افسانہ ہے۔ عام طور سے یہ تسلیم شدہ ہے کہ فکشن کی یہ سب سے مختصر شکل ہے۔ جس میں قصہ، پلاٹ، کردار، نقطۂ عروج، زمان ومکاں جیسے تمام عناصر کے ساتھ ایک لازمی عنصر وحدت تاثر ہوتا ہے۔ کامیاب افسانے میں واقعات کی پیش کش میں وحدتِ تاثر یا واقعاتی مرکز پر اتحاد کے بغیر اچھا افسانہ نہیں لکھا جا سکتا۔ اسی لیے بعض نقادوں نے اسے "چاول پر قل ھواللہ" لکھنے کا فن قرار دیا ہے۔

سجاد حیدر یلدرم نے اردو میں سب سے پہلے مختصر افسانے کی داغ بیل ڈالی۔ ان کا پہلا افسانہ "نشے کی پہلی ترنگ" 1900ء میں شائع ہوا۔ 1904ء میں علی محمود کے افسانے "چھاؤں" کی اشاعت ہوئی لیکن 1907ء سے جب پریم چند کے افسانے منظرِ عام پر آنے لگے اور خاص طور سے جب ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "سوزِ وطن" (1908ء) ضبط ہوا، اس وقت اردو افسانے نے ایک نئی جست لی۔ پریم چند کے یہاں خیالی قصے کہانیوں میں ہم عصر زندگی اور سماج کے تمام ضروری مسائل شامل ہو گئے۔ حالاں کہ سجاد حیدر یلدرم اور ان کے بعض رفقا نے رومانی افسانے لکھنے کا سلسلہ قائم رکھا جن میں نیاز فتح پوری، ل۔ احمد، مجنوں گورکھ پوری، مرزا ادیب، حجاب اسمٰعیل اہم ہیں۔

پریم چند کے زیرِ اثر ترقی پسند افسانہ نگاروں کا ایک پورا قافلہ سامنے آیا۔ سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر کے افسانے "انگارے" (1932ء) میں شامل ہوئے۔ کرشن چندر، بیدی، منٹو اور عصمت چغتائی نے آزادی سے پہلے ہی اردو افسانے میں اپنا مقام متعین کر لیا۔ احمد ندیم قاسمی، حیات اللہ انصاری، سیّد محمد محسن، اپندر ناتھ اشک، دیوندر ستیارتھی اور غلام عبّاس جیسے ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اس عہد میں اپنا مقام بنایا۔ جدیدیت کے زمانے میں غیاث احمد گدی، سریندر پرکاش وغیرہ نئے جدید افسانے کی علامتی فضا قائم کی۔ 1970ء کے بعد افسانے میں علامت نگاری کے عناصر کو کم کرتے ہوئے روایتی بیانیے کی طرف واپسی کو اہمیت دی گئی۔ اس انداز کے افسانے سب سے پہلے سلام بن رزّاق نے لکھے۔ 1970ء کے بعد جن افسانہ نگاروں کی واضح شناخت قائم ہوئی ان میں طارق چھتاری، سید محمد اشرف، شوکت حیات، حسین الحق، عبد الصمد، شفق، انور خاں، ساجد رشید وغیرہ اہم ہیں۔ 1980ء کے بعد خواتین افسانہ نگاروں میں غزال ضیغم اور ترنم ریاض نے اپنے امتیازات واضح کیے۔

اردو مختصر افسانے کی عمر بس ایک صدی کی ہے۔ ادب کی تاریخ میں سو برس ایک مختصر وقفہ ہے لیکن اس صنف نے اتنی ترقی کی جس کے سبب اردو کا دامن وسیع ہوا۔ وقت کے بدلنے کے ساتھ بہت طرح کی تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور افسانے کے اطوار بھی بدلتے رہے لیکن پریم چند نے جس بیانیہ اور سادہ زبان کو افسانے کے لیے آزمایا تھا، وہ اردو افسانے کا سب سے کارگر ہتھیار ثابت ہوا۔ کم وبیش وہ زبان اور تکنیک اب بھی افسانہ نگاروں کے لیے سب سے مرغوب ہے۔

پریم چند

بنارس سے چند میل کے فاصلے پر 'لمہی' نام کا ایک گانو ہے۔ 31 جولائی 1880ء کو اسی گانو میں پریم چند کی پیدائش ہوئی۔ ان کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ وہ گھر میں نواب رائے کے نام سے بھی پکارے جاتے تھے۔ یہی اُن کا ابتدائی قلمی نام بھی تھا۔ ان کے والد منشی عجائب لال ڈاک خانے میں کلرک تھے۔ ان کے دادا گر سہائے لال پٹواری تھے۔

اپنے گانو کی قریبی بستی میں ایک درزی سے، جو پڑھاتے بھی تھے، انھوں نے اردو اور فارسی کے کچھ اسباق پڑھے۔ پریم چند ابھی آٹھ سال کے بھی نہیں تھے کہ ان کی والدہ آنندی دیوی کا انتقال ہوگیا۔ ماں کی وفات کے بعد دادی نے ان کی پرورش کی ذمے داری سنبھالی۔ 1897ء میں ان کے والد کا بھی وصال ہوگیا، اس وقت پریم چند نویں درجے کے طالب علم تھے۔ اب گھر کے اخراجات کا ذمہ انھی کے سر پر آن پڑا۔ انھوں نے ٹیوشن پڑھا کر بڑی مصیبتوں سے اپنے دن کاٹے۔ 1900ء میں بہرائچ کے گورنمنٹ اسکول میں ان کی تقرری ہوئی۔ کان پور کے ضلع اسکول میں ملازمت کے دوران اُن کی دوستی ''زمانہ'' کے مدیر دیا نرائن نگم سے ہوئی۔ انھوں نے پرائیوٹ طور پر بی۔ اے۔ کا امتحان بھی پاس کرلیا۔ 1906ء میں پریم چند نے ایک بیوہ عورت شورانی دیوی سے شادی کے بعد ان کی گھریلو زندگی میں سکون کی کیفیت پیدا ہوئی۔ 1919ء میں جب جلیاں والہ باغ کا واقعہ پیش آیا تو پریم چند نے سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا۔ انھوں نے بنارس میں سرسوتی پریس لگایا۔ یہیں سے انھوں نے 1930ء میں ''ہنس'' نام کا ایک پرچہ ہندی زبان میں جاری کیا۔ ''جاگرن'' کے نام سے ایک اخبار بھی نکالا۔ وہ بمبئی میں فلمی دنیا سے بھی وابستہ ہوئے لیکن وہاں انھیں مایوسی ہاتھ آئی۔ اپریل 1936ء میں لکھنؤ میں ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کانفرنس ہوئی تو پریم چند نے اس کا خطبۂ صدارت پڑھا۔ وہ روسی مصنف میکسم گورکی کے تعزیتی جلسے میں بھی اپنی شدید بیماری کے باوجود شریک ہوئے۔ 8 اکتوبر 1936ء کو پریم چند کا انتقال ہوگیا۔

پریم چند کا ادبی ذوق کم عمری میں ہی پروان چڑھا۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں انھوں نے لکھنا شروع کیا جس کا سلسلہ ان کے وصال تک جاری رہا۔ انھوں نے افسانے، ناول، ڈرامے، اور مضامین لکھے جن کے مجموعوں کی تعداد دو درجن سے زیادہ ہے۔ ''پریم پچیسی''، ''پریم بتیسی''، ''آخری تحفہ''، ''زادِ راہ'' اور ''واردات'' وغیرہ ان کے اہم افسانوی مجموعے ہیں۔ 1908ء میں ''سوزِ وطن'' کے نام سے شائع شدہ ان کے ابتدائی پانچ افسانوں کے مجموعے کو انگریزی سرکار نے ضبط کرلیا تھا۔ ''بازارِ حسن''، جلوۂ ایثار''، ''چوگانِ ہستی''، ''میدانِ عمل''، ''نرملا'' اور ''غبن'' ان کے ناول ہیں۔ ''گئودان'' نہ صرف پریم چند بلکہ اردو کا ایک اہم ناول ہے۔

پریم چند گاندھیائی فکر سے بے حد متاثر تھے۔ ان کی تخلیقات میں اس فکر کا رنگ بہت گہرا نظر آتا ہے۔ انھوں نے دیہی زندگی اور وہاں کی معاشرت کو اپنا خاص موضوع بنایا اور جاگیردارانہ استحصال اور جبر و استبداد پر تفصیل سے لکھا۔ ان کی تخلیقات میں ان کے عہد کے ہندستان کا دل دھڑکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اردو فکشن نے بہت سے نشیب و فراز طے کیے لیکن سرد و گرم ہواؤں کے تھپیڑے کھاتا ہوا اُن کا فن آج بھی تاب دار ہے۔ ان کا فن اردو فکشن کے شعور کا حصہ بن چکا ہے جسے کبھی زوال نہیں۔

پریم چند

روشنی

آئی۔سی۔ایس۔ پاس کر کے ہندستان آیا تو مجھے ممالکِ متحدہ کے ایک کوہستانی علاقے میں ایک سب ڈویژن کا چارج ملا۔ مجھے شکار کا بہت شوق تھا اور کوہستانی علاقے میں شکار کی کیا کمی؟ میری دلی مراد بر آئی۔ ایک پہاڑ کے دامن میں میرا بنگلہ تھا۔ بنگلے ہی پر کچہری کر لیا کرتا تھا۔ اگر کوئی شکایت تھی تو یہ کہ سوسائٹی نہ تھی۔ اس لیے سیر و شکار اور اخبارات و رسائل سے اس کمی کو پورا کیا کرتا تھا۔ امریکہ اور یورپ کے کئی اخبار اور رسالے آتے تھے۔ ان کے مضامین کی شگفتگی اور جدت اور خیال آرائی کے مقابلے میں ہندستانی اخبار اور رسالے بھلا کیا جچتے! سوچتا تھا، وہ دن کب آئے گا کہ ہمارے یہاں بھی ایسے ہی شان دار رسالے نکلیں گے۔

بہار کا موسم تھا، پھاگن کا مہینہ۔ میں دورے پر نکلا اور لندھوار کے تھانے کا معائنہ کر کے گجن پور کے تھانے کو چلا۔ کوئی اٹھارہ میل کی مسافت تھی مگر منظر نہایت سہانا۔ دھوپ میں کسی قدر تیزی تھی مگر ناخوش گوار نہیں۔ ہوا میں بھینی بھینی خوشبو تھی۔ آم کے درختوں میں بور آ گئے تھے اور کوئل کوکنے لگی تھی۔ کندھے پر بندوق رکھ لی تھی کہ کوئی شکار مل جائے تو لیتا چلوں۔ کچھ اپنی حفاظت کا بھی خیال تھا کیوں کہ اُن دنوں جا بجا ڈاکے پڑ رہے تھے۔ میں نے گھوڑے کی گردن سہلائی اور کہا: چلو، بیٹا چلو۔ ڈھائی گھنٹے کی دوڑ ہے۔ شام ہوتے ہوتے گجن پور پہنچ جائیں گے اور ساتھ کے ملازم پہلے ہی روانہ کر دیے گئے تھے۔

جا بجا کاشت کار کھیتوں میں کام کرتے نظر آتے تھے۔ ربیع کی فصل تیار ہو چلی تھی۔ اوکھ اور خربوزے کے لیے زمین تیار کی جا رہی تھی۔ ذرا ذرا سے مزرعے تھے۔ وہی باوا آدم کے زمانے کے بوسیدہ ہل، وہی افسوس ناک جہالت، وہی شرمناک نیم برہنگی! اس قوم کا خدا ہی حافظ ہے۔ گورنمنٹ لاکھوں روپے زراعتی اصلاحوں پر صرف کرتی ہے۔ نئی نئی تحقیقات اور ایجادیں ہوتی ہیں۔ ڈائرکٹر، انسپکٹر سب موجود اور حالت میں کوئی اصلاح، کوئی تغیر نہیں۔ تعلیم کا طوفانِ بے تمیزی برپا ہے۔ یہاں مدرسوں میں کتے لوٹتے ہیں۔ جب مدرسے میں پہنچ جاتا ہوں تو مدرّس کو کھاٹ پر نیم غنودگی کی حالت میں لیٹے پاتا ہوں۔ بڑی دوا دوش سے دس بیس لڑکے جوڑے جاتے ہیں۔ جس قوم پر جمود نے اس حد تک غلبہ کر لیا ہو، اس کا مستقبل انتہا درجہ مایوس کن ہے۔ اچھے اچھے تعلیم یافتہ آدمیوں کو سلف کی یاد میں آنسو بہاتے دیکھتا ہوں۔ مانا کہ ایشیا کے جزائر میں آرین مبلغوں نے مذہب کی روح پھونکی تھی۔ یہ بھی مان لیا کہ کسی زمانے میں اسٹریلیا بھی آرین تہذیب کا ممنون تھا لیکن اس سلف پروری سے کیا حاصل۔ آج تو مغرب دنیا کا مشعلِ ہدایت ہے۔ ننھا سا انگلینڈ نصف کرۂ زمین پر حاوی ہے۔ اپنی صنعت و حرفت کی بدولت بے شک مغرب نے دنیا کو ایک نیا پیغام عمل عطا کیا ہے اور جس قوم میں اس پیغام پر عمل کرنے کی قوت نہیں ہے، اس کا مستقبل تاریک ہے جہاں آج بھی نیم برہنہ گوشہ نشیں فقیروں کی عظمت کے راگ الاپے جاتے ہیں۔ آج بھی شجر و حجر کی عبادت ہوتی ہے۔ جہاں آج بھی زندگی کے ہر ایک شعبے میں مذہب گھسا ہوا ہے۔ اس کی اگر یہ حالت ہے تو تعجب کا کوئی مقام نہیں۔

میں انھیں تصورات میں ڈوبا ہوا چلا جا رہا تھا۔ دفعتاً ٹھنڈی ہوا کا جھونکا جسم میں لگا تو میں نے سر اوپر اٹھایا۔ مشرق کی

جانب منظر گرد آلود ہو رہا تھا، اُفق گرد و غبار کے پردے میں چھپ گیا تھا، آندھی کی علامت تھی۔ میں نے گھوڑے کو تیز کیا لیکن لمحہ بہ لمحہ غبار کا پردہ وسیع اور بسیط ہوتا جاتا تھا اور میرا راستہ بھی مشرق ہی کی جانب تھا۔ گویا میں یکہ و تنہا طوفان کا مقابلہ کرنے دوڑا جا رہا تھا۔ ہوا تیز ہوگئی۔ وہ پردۂ غبار سر پر آپہنچا اور دفعتاً میں گرد کے سمندر میں ڈوب گیا۔ ہوا اتنی تند تھی کہ کئی بار میں گھوڑے سے گرتے گرتے بچا۔ وہ سرسراہٹ اور گڑگڑاہٹ تھی کہ الاماں۔ گویا فطرت نے آندھی میں طوفان کی روح ڈال دی ہے۔ دس بیس ہزار توپیں ایک ساتھ چھوٹتیں تب بھی اتنی ہولناک صدا نہ پیدا ہوتی۔ مارے گرد کے کچھ نہ سوجھتا تھا۔ یہاں تک کہ راستہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ اُف ایک قیامت تھی جس کی یاد سے آج بھی کلیجہ کانپ جاتا ہے۔ میں گھوڑے کی گردن سے چمٹ گیا اور اس کے ایالوں میں منہ چھپالیا۔ سنگ ریزے گرد کے ساتھ اُڑ کر منہ پر اس طرح لگتے تھے جیسے کوئی کنکریوں کو پچکاری میں بھر کر مار رہا ہو۔ ایک عجیب دہشت مجھ پر مسلط ہوگئی۔ کسی درخت کے اُکھڑنے کی آواز کانوں میں آجاتی تو پیٹ میں میری آنتیں تک سمٹ جاتیں۔ کہیں کوئی درخت پہاڑ سے میرے اوپر گرے تو یہیں رہ جاؤں۔ طوفان میں ہی بڑے بڑے تودے بھی تو ٹوٹ جاتے ہیں۔ کوئی ایسا تودہ لڑھکتا ہوا آجائے تو بس خاتمہ ہے، ہلنے کی بھی تو گنجائش نہیں۔ پہاڑی راستہ کچھ سجھائی دیتا نہیں۔ ایک قدم داہنے بائیں ہو جاؤں تو ایک ہزار فٹ گہرے کھڈ میں پہنچ جاؤں۔ عجیب ہیجان میں مبتلا تھا۔ کہیں شام تک طوفان جاری رہا تو موت ہی ہے۔ رات کو کوئی درندہ آکر صفایا کر دے گا۔ دل پر بے اختیار رقت کا غلبہ ہوا۔ موت بھی آئی تو اس حالت میں کہ لاش کا بھی پتا نہ چلے۔ اُفوہ! کتنی زور سے بجلی چمکی ہے کہ معلوم ہوا ایک نیزہ سینے کے اندر گھس گیا۔

دفعتاً جھن جھن کی آواز سن کر میں چونک پڑا۔ اس ازاہٹ میں بھی جھن جھن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی سانڈنی دوڑی آرہی ہو۔ سانڈنی پر کوئی سوار تو ہوگا ہی۔ مگر اسے راستہ کیوں کر سوجھ رہا ہے؟ کہیں سانڈنی ایک قدم بھی ادھر اُدھر ہو جائے تو بچہ تحت الثریٰ میں پہنچ جائے۔ کوئی زمین دار ہوگا، مجھے دیکھ کر شاید پہچانے بھی نہیں، چہرے پر منوں گرد پڑی ہوئی ہے مگر ہے بلا کا ہمت والا۔

ایک لمحے میں جھن جھن کی آواز قریب آگئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک جوان عورت سر پر ایک کھانچی رکھے قدم بڑھاتی ہوئی چلی آرہی ہے۔ ایک گز کے فاصلے سے بھی اس کا صرف دھندلا سا عکس نظر آیا۔ وہ عورت ہو کر اکیلی مردانہ وار چلی جارہی ہے۔ نہ آندھی کا خوف ہے، نہ ٹوٹنے والے درختوں کا اندیشہ، نہ چٹانوں کے گرنے کا غم۔ گویا یہ بھی کوئی روزمرّہ کا معمولی واقعہ ہے۔ مجھے دل میں غیرت کا احساس کبھی اتنا شدید نہ ہوا تھا۔

میں نے جیب سے رومال نکال کر منہ پونچھا اور اس سے بولا۔ ''او عورت! اگجن پور یہاں سے کتنی دور ہے؟''

میں نے پوچھا تو بلند لہجے میں مگر آواز دس گز نہ پہنچی۔ عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔

میں نے چیخ کر پکارا۔ ''او عورت! ذرا ٹھہر جا۔ اگجن پور یہاں سے کتنی دور ہے؟'' عورت رُک گئی۔ اس نے میرے قریب آکر، مجھے دیکھ کر ذرا سر جھکا کر کہا۔ ''کہاں جاؤ گے؟''

''اگجن پور کتنی دور ہے؟''

"چلے آؤ۔ آگے ہمارا گانو ہے۔ اس کے بعد گجن پور ہے۔"

"تمھارا گانو کتنی دور ہے؟"

"وہ کیا آگے دکھائی دیتا ہے۔"

"تم اس آندھی میں کہیں رُک کیوں نہیں گئیں؟"

"چھوٹے چھوٹے بچے گھر پر ہیں۔ کیسے رُک جاتی۔ مردتو بھگوان کے گھر چلا گیا۔" آندھی کا ایسا زبردست ریلا آیا کہ میں شاید دو تین قدم آگے کھسک گیا۔ گرد وغبار کی ایک دھونکنی سی منھ پر لگی۔ اس عورت کا کیا حشر ہوا، مجھے خبر نہیں۔ میں پھر وہیں کھڑا رہ گیا۔ فلسفے نے کہا، اس عورت کے لیے زندگی میں کیا راحت ہے؟ کوئی ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا ہوگا، دو تین فاقہ کش بچے۔ بیکسی میں موت کا کیا غم؟ موت تو اسے باعثِ نجات ہوگی۔ میری حالت اور ہے۔ زندگی اپنی تمام دل فریبیوں اور رنگینیوں کے ساتھ میری ناز برداری کر رہی ہے۔ حوصلے ہیں، ارادے ہیں۔ میں اسے کیوں کر خطرے میں ڈال سکتا ہوں۔

میں نے پھر گھوڑے کے ایالوں میں منھ چھپالیا۔ شترمرغ کی طرح جو خطرے سے بچنے کی کوئی راہ نہ پا کر بالو میں سر چھپالیتا ہے۔

وہ آندھی کی آخری سانس تھی، اس کے بعد بہ تدریج زور کم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ کوئی پندرہ منٹ میں مطلع صاف ہوگیا۔ نہ گرد وغبار کا نشان تھا، نہ ہوا کے جھونکوں کا۔ ہوا میں ایک فرحت بخش خنکی آگئی تھی۔ ابھی مشکل سے پانچ بجے ہوں گے۔ سامنے ایک پہاڑی تھی، اس کے دامن میں ایک چھوٹا سا موضع تھا۔ میں جوں ہی اس گانو میں پہنچا۔ وہی عورت ایک بچے کو گود میں لیے میری طرف آرہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ تم کہاں رہ گئے تھے؟ میں ڈری کہ تم رستہ نہ بھول گئے ہو۔ تمھیں ڈھونڈنے جارہی تھی۔

میں نے اس کی انسانیت سے متاثر ہو کر کہا، "میں اس کے لیے تمھارا بہت ممنون ہوں"۔ آندھی کا ایسا ریلا آیا کہ مجھے رستہ نہ سوجھا۔ میں وہیں کھڑا ہوگیا۔ یہی تمھارا گانو ہے؟ یہاں سے گجن پور کتنی دور ہوگا؟

"بس کوئی دھاپ بھر سمجھ لو۔ راستہ بالکل سیدھا ہے، کہیں داہنے بائیں مُڑیو نہیں۔ سورج ڈوبتے ڈوبتے پہنچ جاؤ گے۔"

"یہی تمھارا بچہ ہے"؟

"نہیں، ایک اور اس سے بڑا ہے۔ جب آندھی آئی تو دونوں نمبردار کی چوپال میں جا کر بیٹھے تھے کہ جھوپڑیا کہیں اُڑ نہ جائے۔ جب سے آئی ہوں، یہ میری گود سے نہیں اترتا۔ کہتا ہے، تو پھر کہیں بھاگ جائے گی۔ بڑا شیطان ہے۔ بڑا لڑکوں میں کھیل رہا ہے۔ محنت مزدوری کرتی ہوں بابو جی! ان کو پالنا تو ہے۔ اب میرے لیے کون بیٹھا ہوا ہے جس پر ٹیک کروں۔ گھاس لے کر بیچنے گئی تھی۔ کہیں جاتی ہوں، من ان بچوں میں لگا رہتا ہے۔"

میرا دل اتنا اثر پذیر تو نہیں ہے لیکن اس دہقان عورت کے بے لوث اندازِ گفتگو، اس کی سادگی اور جذبۂ مادری نے مجھ پر تسخیر کا سا عمل کیا۔ اس کے حالات سے مجھے گونہ دلچسپی ہوگئی۔ پوچھا، "تمھیں بیوہ ہوئے کتنے دن ہوگئے۔"

عورت کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے بچے کے رخسار کو اپنی آنکھوں سے لگا کر بولی: "ابھی

توکل چھے مہینے ہوئے ہیں، بابوجی۔ بھگوان کی مرضی میں آدمی کا کیا۔ بس بھلے چنگے مل لے کر لوٹے، ایک لوٹا پانی پیا، قے ہوئی۔ بس آنکھیں بند ہو گئیں۔ نہ کچھ کہا نہ سُنا۔ میں سمجھی تھکے ہیں، سو رہے ہیں۔ جب کھانا کھانے کو اٹھانے لگی تو بدن ٹھنڈا۔ تب سے بابوجی! گھاس چھیل کر پیٹ پالتی ہوں اور بچوں کو کھلاتی ہوں۔ کھیتی میرے مان کی نہ تھی۔ بیل بدھیے بیچ کر انھیں کے کریا کرم میں لگا دیے۔ بھگوان تمھارے ان دونوں گلابوں کو جلا دے، میرے لیے یہی بہت ہیں۔"

میں موقع اور محل سمجھتا ہوں اور نفسیات میں بھی دخل رکھتا ہوں لیکن اس وقت مجھ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ میں آب دیدہ ہو گیا اور جیب سے پانچ روپے نکال کر اس عورت کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "میری طرف سے یہ بچوں کے مٹھائی کھانے کے لیے لے لو، مجھے موقع ملا تو پھر کبھی آؤں گا"۔ یہ کہہ کر میں نے بچے کے رخساروں کو انگلی سے چھو دیا۔

ماں ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔ "نہیں بابوجی، یہ رہنے دیجیے، میں غریب ہوں لیکن بھکارن نہیں ہوں"۔

"یہ بھیک نہیں ہے، بچوں کی مٹھائی کھانے کے لیے ہے۔"

"نہیں بابوجی۔"

"مجھے اپنا بھائی سمجھ کر لے لو۔"

"نہیں بابوجی۔ جس سے بیاہ ہوا، اس کی عزت تو میرے ہی ہاتھ ہے۔ بھگوان تمھارا بھلا کریں۔ اب چلے جاؤ نہیں تو دیر ہو جائے گی۔"

میں دل میں خفیف اتنا کبھی نہ ہوا تھا۔ جنھیں میں جاہل کور باطن، بے خبر سمجھتا تھا۔ اسی طبقے کی ایک معمولی عورت میں یہ خودداری، یہ فرض شناسی، یہ توکل! اپنے ضعف کے احساس سے میرا دل جیسے پامال ہو گیا۔ اگر تعلیم فی الاصل تہذیب نفس ہے اور محض اعلا ڈگریاں نہیں تو یہ عورت تعلیم کی معراج پر پہنچی ہوئی ہے۔

میں نے نادم ہو کر نوٹ جیب میں رکھ لیا اور گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے پوچھا۔ "تمھیں اس آندھی میں ذرا سا ڈر نہ معلوم ہوتا تھا؟"

عورت مسکرائی۔ "ڈر کس بات کا؟ بھگوان تو سبھی جگہ ہیں۔ اگر وہ مارنا چاہیں تو کیا یہاں نہیں مار سکتے؟ میرا آدمی تو گھر آ کر بیٹھے بیٹھے چل دیا۔ آج وہ ہوتا تو تم اس طرح جگن پور اکیلے نہ جا پاتے۔ جا کر تمھیں پہنچا آتا۔ تھوڑی خدمت کرتا۔"

گھوڑا اڑا۔ میرا دل اس سے زیادہ تیزی سے اُڑ رہا تھا، جیسے کوئی مفلس سونے کا ڈلا پا کر دل میں ایک طرح کی پرواز کا احساس کرتا ہے، وہی حالت میری تھی۔ اس دہقان عورت نے مجھے وہ تعلیم دی جو فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کے دفتروں سے بھی نہ حاصل ہوئی تھی۔ میں اس مفلس کی طرح اس سونے کے ڈلے کو گرہ میں باندھتا ہوا ایک غیر مترقبہ نعمت کے غرور سے مسرور، اس اندیشے سے خائف کہ کہیں یہ اثر دل سے مٹ نہ جائے، اُڑا چلا جاتا تھا۔ بس یہی فکر تھی کہ اس پارۂ زر کو دل کے کسی گوشے میں چھپا لوں جہاں کسی حریص کی اس پر نگاہ نہ پڑے۔

جگن پور ابھی پانچ میل سے کم نہ تھا۔ راستہ نہایت پیچیدہ بیہڑ، بے برگ و بار۔ گھوڑے کو روکنا پڑا۔ تیزی میں جان کا

خطرہ تھا۔ آہستہ آہستہ سنبھلتا چلا جاتا تھا کہ آسمان پر ابر گھر آیا۔ کچھ کچھ تو پہلے ہی سے چھایا ہوا تھا۔ پر اب اس نے ایک عجیب صورت اختیار کی۔ برق کی چمک اور رعد کی گرج شروع ہوئی۔ پھر افق مشرق کی طرف سے زرد رنگ کے ابر کی اس نئی تہہ اس مٹیالے رنگ پر زرد لیپ کرتی ہوئی تیزی سے اوپر کی جانب دوڑتی نظر آئی۔ میں سمجھ گیا، اولے ہیں۔ پھاگن کے مہینے میں اس رنگ کے بادل اور گرج کی یہ مہیب گڑگڑاہٹ ژالہ باری کی علامت ہے۔ گھٹا سر پر بڑھتی چلی جاتی تھی۔ یکا یک سامنے ایک کفِ دست میدان آ گیا جس کے پرلے سرے پر گجن پور کے ٹھاکر دوارے کا کلس صاف نظر آ رہا تھا۔ کہیں کسی درخت کی بھی آڑ نہ تھی لیکن میرے دل میں مطلق کمزوری نہ تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مجھ پر کسی کا سایہ ہے جو مجھے ہر آفت، ہر گزند سے محفوظ رکھے گا۔

ابر کی زردی ہر لحہ بڑھتی جاتی تھی۔ شاید گھوڑا اس خطرے کو سمجھ رہا تھا۔ وہ بار بار ہنہناتا تھا اور اُڑ کر خطرے سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے بھی دیکھا راستہ صاف ہے۔ لگام ڈھیلی کر دی۔ گھوڑا اُڑا۔ میں اس کی تیزی کا لطف اٹھا رہا تھا۔ دل میں خوف کا مطلق احساس نہ تھا۔

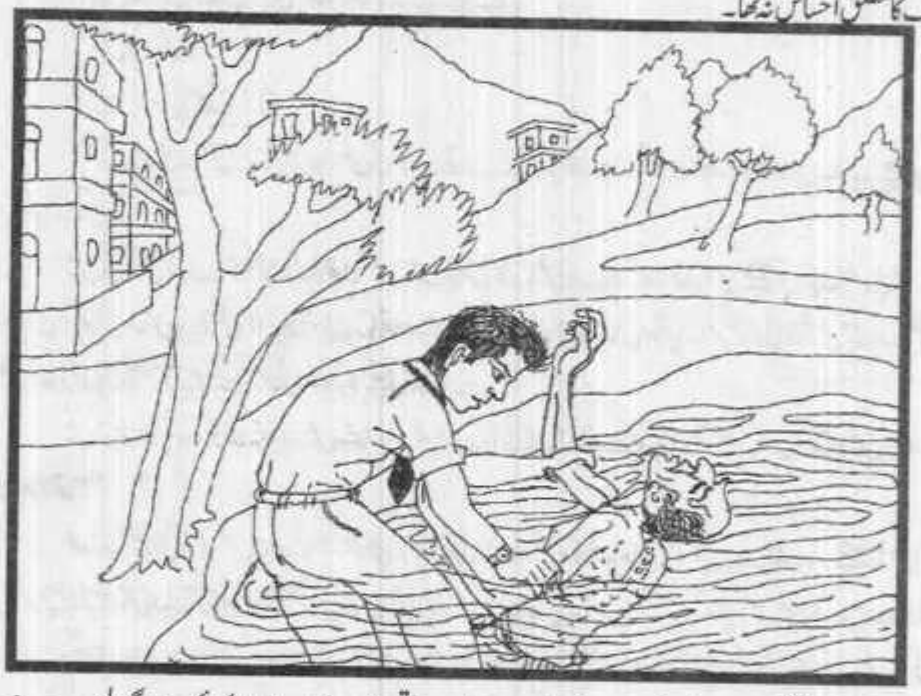

ایک میل نکل گیا ہوں گا، ایک ریپٹ آ پڑی۔ پہاڑی ندی تھی جس کے پیٹے میں کوئی پچاس گز لمبی ریپٹ بنی ہوئی تھی۔ پانی کی ہلکی دھار ریپٹ پر سے اب بھی بہہ رہی تھی۔ ریپٹ کے دونوں طرف پانی جمع تھا۔ میں نے دیکھا، ایک اندھا لاٹھی ٹیکتا ہوا ریپٹ سے گزر رہا تھا۔ وہ ریپٹ کے ایک کنارے سے اتنا قریب تھا کہ میں ڈر رہا تھا کہیں گر نہ پڑے۔ اگر پانی میں گرا تو مشکل ہوگی کیوں کہ وہاں پانی گہرا تھا۔ میں نے چلا کر کہا۔ ''بڈھے اور داہنے کو ہو جا۔''

بڈھا چونکا اور گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سن کر شاید ڈر گیا۔ داہنے تو نہیں ہوا اور بائیں طرف ہو لیا اور پھسل کر پانی

میں، گر پڑا۔ اسی وقت ایک ننھا سا اولا میرے سامنے گرا۔ دونوں مصیبتیں ایک ساتھ نازل ہوئیں۔

ندی کے اس پار ایک مندر تھا۔ اس میں بیٹھنے کی جگہ کافی تھی۔ میں ایک منٹ میں وہاں پہنچ سکتا تھا لیکن یہ نیا عقدہ سامنے آ گیا۔ کیا اس اندھے کو مرنے کے لیے چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگوں؟ حمیت نے اسے گوارا نہ کیا۔ زیادہ پس وپیش کا موقع نہ تھا۔ میں فوراً گھوڑے سے کودا اور کئی اولے میرے چاروں طرف گرے، میں پانی میں کود پڑا۔ ہاتھی ڈباؤ پانی تھا۔ رپٹ کے لیے جو بنیاد کھودی گئی تھی، وہ ضرورت سے زیادہ چوڑی تھی۔ ٹھیکے دار نے دس فٹ چوڑی رپٹ تو بنا دی مگر کھدی ہوئی مٹی برابر نہ کی۔ بڈھا اسی گڈھے میں گرا تھا۔ میں بھی ایک غوطہ کھا گیا لیکن تیرنا جانتا تھا، کوئی اندیشہ نہ تھا۔ میں نے دوسری ڈبکی لگائی اور اندھے کو باہر نکالا۔ اتنی دیر میں وہ سیروں پانی پی چکا تھا۔ جسم بے جان ہو رہا تھا۔ میں اسے لیے بڑی مشکل سے باہر نکلا۔ دیکھا تو گھوڑا بھاگ کر مندر میں جا پہنچا ہے۔ اس نیم جان لاش کو لیے ہوئے ایک فرلانگ چلنا آسان نہ تھا۔ اوپر اولے تیزی سے گرنے لگے تھے۔ کبھی سر پر، کبھی شانے پر، کبھی پیٹھ میں گولی سی لگ جاتی تھی۔ میں تلملا اٹھتا تھا لیکن اس لاش کو سینے سے لگائے مندر کی طرف لپکا جاتا تھا۔ میں اگر اس وقت اپنے دل کے جذبات بیان کروں تو شاید خیال ہو، میں خواہ مخواہ تعلی کر رہا ہوں۔ اچھے کام کرنے میں ایک خاص مسرّت ہوتی ہے مگر میری خوشی ایک دوسری ہی قسم کی تھی۔ وہ فاتحانہ مسرّت تھی۔ میں نے اپنے اوپر فتح پائی تھی۔ آج سے پہلے غالباً میں اس اندھے کو پانی میں ڈوبتے دیکھ کر یا تو اپنی راہ چلا جاتا یا پولیس کو رپورٹ کرتا۔ خاص کر ایسی حالت میں جب کہ سر پر اولے پڑ رہے ہوں۔ میں کبھی پانی میں نہ گھستا۔ ہر لحہ خطرہ تھا کہ کوئی بڑا سا اولا سر پر گر کر عزیز جان کا خاتمہ نہ کر دے۔ مگر میں خوش تھا کیوں کہ آج میری زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

میں مندر میں پہنچا تو سارا جسم زخمی ہو رہا تھا۔ مجھے اپنی فکر نہ تھی۔ ایک زمانہ ہوا، میں نے فوری امداد (فرسٹ ایڈ) کی مشق کی تھی، وہ اس وقت کام آئی۔ میں نے آدھ گھنٹے میں اس اندھے کو اٹھا کر بیٹھا دیا۔ اتنے میں دو آدمی اندھے کو ڈھونڈتے ہوئے مندر میں آ پہنچے۔ مجھے اس کی تیمارداری سے نجات ملی۔ اولے نکل گئے تھے۔ میں نے گھوڑے کی پیٹھ ٹھونکی۔ رومال سے ساز کو صاف کیا اور جگن پور چلا۔ بے خوف، بے خطر، دل میں ایک غیبی طاقت محسوس کرتا ہوا۔ اسی وقت اندھے نے پوچھا۔ ''تم کون ہو بھائی، مجھے تو کوئی مہاتما معلوم ہوتے ہو۔''

میں نے کہا، ''تمھارا خادم ہوں۔''

''تمھارے سر پر کسی دیوتا کا سایہ معلوم ہوتا ہے۔''

''ہاں ایک دیوی کا سایہ ہے۔''

''وہ کون دیوی ہے؟''

''وہ دیوی پیچھے کے گانو میں رہتی ہے۔''

''تو کیا وہ عورت ہے؟''

''نہیں، میرے لیے تو وہ دیوی ہے۔''

لفظ و معنی

مُراد بَر آنا	-	مقصد پورا ہونا
کوہستانی	-	پہاڑی
بُور آنا	-	آم کے درخت میں پھول لگنا
کاشت کار	-	کھیتی کرنے والا، کسان
ربیع	-	وہ فصل جو اکتوبر-نومبر میں بوئی اور مارچ-مئی میں کاٹی جائے، خریف کی ضد
مزرعہ	-	کھیتی
بوسیدہ	-	پرانا
تحقیق	-	کسی چیز کے بارے میں پوری طرح سے جاننا، چھان بین
تغیر	-	بدلاو، تبدیلی
مدرّس	-	درس دینے والا، پڑھانے والا
نیم	-	آدھا
غنودگی	-	اونگھ، نیند
دوا دوش	-	ہر طرف دوڑنا، دوڑ دھوپ
جمود	-	رُکا ہوا، بے حرکت
غلبہ	-	حاوی
سَلَف	-	پہلے لوگ، پُرکھے
مَشعل	-	شمع، چراغ
کُرہ	-	گنبد، گولا، ہر گول چیز
کُرۂ ارض	-	پوری زمین
صنعت و حرفت	-	ہاتھ یا مشین سے چیزیں بنانا، انڈسٹری، پیشہ، کاری گری
برہنہ	-	ننگا
حَجَر	-	پتھر
بسیط	-	کشادہ
تند	-	تیز، غضب ناک
اُفق	-	آسمان کا کنارہ
الامان	-	کلمہ خوف، امن، پناہ

ایال - گھوڑے کی گردن کے لمبے بال
مسلّط - وہ جو کسی پر غالب کر دیا جائے
ہیجان - جوش، تیزی، بھڑک
رِقّت - دل بھر آنا، مجازاً رونا
تحت الثریٰ - زیرِ زمین، زمین کا سب سے نیچے کا حصّہ، پاتال
دل فریبی - خوب صورتی، من موہ لینا
ناز برداری - ناز اٹھانا، ناز یا چونچلے کا برداشت کرنا
بہ تدریج - درجہ بہ درجہ، تھوڑا تھوڑا، آہستہ آہستہ
دھاپ - میل بھر، انسان کے ایک سانس میں دوڑنے کا فاصلہ
اثر پذیر - اثر قبول کرنا
تسخیر - تابع کرنا، قابو میں لانا
خفیف - شرمندہ، ہلکا
کور باطن - کینہ پرور، دل میں کینہ رکھنے والا، حاسد
توکّل - خدا پر بھروسہ کرنا
فی الاصل - اصل میں، حقیقت میں
مابعد الطبیعات - فطرت سے سوا غیر مادّی حقیقت، ماورائی حقیقت
غیر مترقّبہ - خداداد مال، وہ دولت جو بغیر محنت کے حاصل ہو جائے
پارۂ زر - سونے کا ٹکڑا
رَعد - بجلی
مہیب - خوفناک، بھیانک
ژالہ باری - برف باری
پرلے سرے پر - آخری سرے پر
رپٹ - پھسلن
پیٹا - دریا کے بہنے کا راستہ، دریا کا پاٹ
کفِ دست - ہتھیلی
تعلّی - شیخی، ڈینگ
حمیّت - غیرت، شرم

آپ نے پڑھا

- اکثر مشاہدے میں یہ بات آتی ہے کہ ایک آئی۔سی۔ایس۔افسر کا ٹھاٹ باٹ اور رہن سہن عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔لیکن صرف ایک معمولی سے واقعے کا اثر اس کے دل و دماغ پر اس طرح قائم ہوا جس سے وہ اپنی ساری رعونت اور افسرانہ تمکنت بھول کر عام لوگوں کے دکھ سکھ کا ساتھی بن جاتا ہے۔کہانی میں طوفان کا منظر اور افسر کے طوفان میں پھنسنے کا واقعہ اس بات کا اشاریہ ہے کہ وہ آرام طلبی اور نفاست کو تیاگ کر مشکلات اور دکھوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہے۔وہ زندگی کی سچائیوں کو مزید قریب سے دیکھنا سمجھنا چاہتا ہے۔
- ''روشنی'' ایک سیدھی سادی بیانیہ طرز میں لکھی گئی کہانی ہے۔پریم چند نے اس میں جہاں فارسی اور عربی کے مشکل الفاظ استعمال کیے ہیں وہیں گانو میں بولے جانے والے الفاظ کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔اسی سے کہانی کا فطری ماحول قائم ہوا ہے۔
- اس کہانی میں شروع سے آخر تک دلچسپی قائم رہتی ہے۔ایک طرف بہار کا موسم ہے، کوئل کی کوک ہے، بھینی بھینی خوشبو ہے، سہانے قدرتی مناظر ہیں تو دوسری طرف قدرتی آفات ہیں، طوفان کی ہولناکی ہے، حالات کی خوفناکی ہے۔یہاں افسانہ نگار نے متضاد صورتِ حال کو اس طرح مربوط کیا ہے کہ پڑھنے والے رفتہ رفتہ کہانی کے سحر میں آجاتے ہیں۔
- ایک معمولی عورت کی خودداری، فرض شناسی اور توکل پسندی نے اعلا افسر کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور وہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ تعلیم صرف اعلا ڈگریوں میں پوشیدہ نہیں۔''روشنی'' میں اس عورت کا اعلا کردار اور عمل ایک افسر کو اپنے فرض کی پہچان عطا کرتا ہے اور وہ ایک نابینا بوڑھے کی جان بچا کر ابدی سکون و مسرت محسوس کرتا ہے۔

کچھ اور باتیں

- اس کہانی میں دو مرکزی کردار ہیں۔ایک اعلا سرکاری افسر (آئی۔سی۔ایس۔) ہے تو دوسرا ایک صاحبِ اولاد غریب بیوہ۔دو متضاد حالات ہیں۔دونوں کرداروں کے الگ الگ ماحول اور پس منظر ہیں لیکن افسانہ نگار نے کمال خوبی کے ساتھ دونوں بے میل کرداروں کو ایک مرکز پر لا کھڑا کیا ہے۔کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے، دونوں قریب آتے جاتے ہیں اور اختتام تک دونوں کردار ہم خیال اور ہم مزاج ہو جاتے ہیں۔
- کہانی ''روشنی'' پریم چند کی فن کاری کی عمدہ مثال ہے۔افسانہ نگار نے بہت ہی ہنرمندی کے ساتھ واقعات کی کڑیوں کو جوڑا ہے۔بیچ میں ذیلی اور ضمنی باتیں بھی آتی ہیں لیکن وہ کہانی کے مرکزی خیال پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔یہ باتیں افسانہ نگار کے موقف اور نصب العین کو واضح کرتی ہیں۔
- پریم چند کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ وہ اپنی کہانیوں میں مشکل، ناقابلِ فہم اور مصنوعی زبان کے استعمال

سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کی بیشتر کہانیاں دیہی علاقوں سے متعلق ہیں۔ ہندستان گانو دیہات کا دیس ہے۔ اس لیے پریم چند گانو کو اولیت دیتے ہیں اور اس مخصوص ماحول کی بولی ٹھولی کو اپنی کہانیوں میں زیادہ سے زیادہ جگہ دیتے ہیں۔

- اُن کی کہانیوں میں منظر کشی اور مکالمہ نگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کہانی میں بھی منظر کی بہترین پیش کش موجود ہے۔ بیوہ عورت اور آئی۔سی۔ایس۔ افسر کے درمیان کئی مقامات پر جو گفتگو ہوتی ہے، برجستہ اور موقع محل کے اعتبار سے مناسب ہے۔
- افسانہ ''روشنی'' پہلی بار مشہور ادبی رسالے ''ادبی دنیا'' کے نوروز نمبر بابت 1932ء شائع ہوا تھا۔ یہ اُن کے مجموعے ''واردات'' میں شامل ہے۔

آپ بتایئے

1- افسانہ ''روشنی'' پریم چند کی کس کتاب سے ماخوذ ہے؟
2- آئی۔سی۔ایس۔ افسر کس سواری سے معائنہ کے لیے نکلا تھا؟
3- عورت نے آئی۔سی۔ایس۔ کا روپیہ کیوں واپس کر دیا؟
4- بوڑھے کو ڈوبنے سے کس نے بچایا؟
5- بیوہ عورت سے آئی۔سی۔ایس۔ افسر نے کیا سیکھا؟
6- پریم چند نے اس کہانی کا عنوان ''روشنی'' کیوں رکھا؟
7- پریم چند کا اصلی نام کیا ہے؟
8- ان کی پیدائش کہاں ہوئی؟
9- دہقانی عورت کے کتنے بچے تھے؟
10- افسر کس کی انسانیت سے متاثر ہوا؟

معروضی سوالات

(i) ان میں کون سی کہانی پریم چند کی ہے؟
(الف) کھول دو (ب) بابا نور (ج) کفن (د) گرم کوٹ

(ii) ''روشنی'' کیا ہے؟
(الف) داستان (ب) ناول (ج) افسانہ (د) ڈراما

(iii) آئی۔سی۔ایس۔ کس علاقے میں رہتا تھا؟
(الف) شہری (ب) کوہستانی (ج) ریگستانی (د) برفیلے

(iv) گڈھے میں کون گرا تھا؟

(الف) ایک عورت (ب) ایک بوڑھا (ج) ایک بچہ (د) ایک مسافر

(v) بدھ نے مہاتما کس کو کہا؟

(الف) آئی۔پی۔ایس۔کو (ب) آئی۔ایف۔ایس۔کو

(ج) آئی۔سی۔ایس۔کو (د) آئی۔اے۔ایس۔کو

(vi) آئی۔سی۔ایس۔نے عورت کو دیوی اس لیے کہا کیوں کہ

(الف) وہ خوبصورت تھی (ب) اس میں عزتِ نفس اور صبر و توکل کا مادہ تھا

(ج) وہ مندر میں رہتی تھی (د) وہ ہر وقت پوجا کرتی تھی

درج ذیل لفظوں سے جملے بنائیے

تاریکی برہنہ ژالہ شجر حریص

بوسیدہ افق طوفان رعد ابر

اضداد لکھیے:

شب زمین خوشبو قریب غم شجر خواب حق

مندرجہ ذیل الفاظ سے اس طرح جملے بنائیے جس سے ان کی جنسیت ظاہر ہو:

مراد پیغام زندگی پانی افق آواز عکس نادم

اس افسانے میں

- ''آئی۔سی۔ایس۔پاس کر کے ہندستان آیا تو مجھے ممالک متحدہ کے ایک کوہستانی علاقے میں ایک سب ڈویژن کا چارج ملا۔'' اس جملے سے کہانی ''روشنی'' کا آغاز ہوتا ہے۔آئی۔سی۔ایس۔افسر نے ''میں'' لکھا ہے۔کہانی میں ''میں'' کون ہوتا ہے؟ ''میں'' کے ذمے کون سا کام تھا جسے انجام دینے کے لیے وہ بنگلے سے نکلا تھا۔مختصراً لکھیے۔
- ''بہار کا موسم تھا.....آم کے درختوں میں بور آ گئے تھے۔ہوا میں بھینی بھینی خوشبو تھی۔کوئل کوکنے لگی تھی۔'' کہانی میں ایسے حصے کو کیا کہتے ہیں؟
- اس عورت کے لیے زندگی میں کیا راحت ہے؟ کوئی ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا ہوگا، دو تین فاقہ کش بچے، بے کسی میں موت کا کیا غم۔موت تو اسے باعث نجات ہوگی۔میری حالت اور ہے۔زندگی اپنی تمام دل فریبیوں اور رنگینیوں

کے ساتھ میری ناز برداری کر رہی ہے۔'' اس عبارت کے سیاق وسباق پر غور کیجیے۔ یہ باتیں کس نے اور کس لیے کہی ہیں؟ ایک سو لفظوں میں اس کی وضاحت کیجیے۔

- اس کہانی میں ''روشنی'' کو تبدیلی ذہن یا ماہیتِ قلب کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ روشنی آئی۔سی۔ایس۔ افسر کو کیسے ملی؟ وہ جب افسری کے دائرے سے باہر آیا تو اس نے کیا کر دکھایا؟ سو لفظوں میں لکھیے۔
- اس افسانے میں کچھ علاقائی اور دیہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ان کی نشان دہی کیجیے۔
- بیوہ عورت مجبور ہوتے ہوئے بھی آئی۔سی۔ایس۔ کا پیسہ لینے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟

مختصر گفتگو

1- افسانہ ''روشنی'' ہمیں کیا پیغام دے رہا ہے؟
2- افسانہ ''روشنی'' میں افسر کہاں سے کہاں جا رہا تھا؟
3- افسر نے کیوں اس اندھے بوڑھے کی مدد کی؟
4- افسر نے عورت کو روپے نکال کر کیوں دیے اور اس نے کیا کیا؟

تفصیلی گفتگو

1- افسر کے مشاغل کیا تھے؟
2- عورت کے کردار سے افسر کیوں متاثر ہوا؟
3- اس کہانی میں کون سا درس پوشیدہ ہے؟
4- پریم چند کی افسانہ نگاری پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
5- افسانہ ''روشنی'' پریم چند کی دیگر مشہور کہانیوں کے مقابلے آپ کو کیسی لگی؟ مدلل بحث کیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1- درس دینے والی پریم چند کی دو دوسری کہانیوں کو پڑھ کر سنایئے۔
2- ہم پریم چند کی کہانی سے سبق لے کر سماج کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ دس جملے میں بتایئے۔
3- لائبریری سے پریم چند کی مشہور کہانیوں کو تلاش کیجیے اور انھیں زیراکس کرا کے ایک مجموعے کی شکل میں اپنے پاس رکھیے اور ان کا مطالعہ کیجیے۔

سیّد محمد محسن

سیّد محمد محسن جولائی 1910ء میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سیّد محمد رشید اور دادا سیّد وحید الدین تھے۔ محسن کے نانا یوسف حسین کاکو کے رہنے والے تھے۔ یہ سر سیّد کی تعلیمی تحریک سے بے حد متاثر تھے۔ محسن کا دادھیالی اور نانھیالی دونوں گھرانہ عصری تعلیم سے بہرہ مند تھا۔

ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ انھوں نے 1926ء میں رام موہن رائے سیمنری اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور 1931ء میں پٹنہ کالج سے فلسفے میں آنرز کیا۔ 1934ء میں اعلا نمبروں سے ایم۔اے۔ پاس کرنے پر انھیں گولڈ میڈل ملا اور حکومت نے انھیں ریسرچ اسکالرشپ سے نوازا۔ ایم۔اے۔ میں خصوصی مضمون نفسیات تھا۔ 1938ء میں پٹنہ کالج میں تدریس کی ذمّے داریاں سنبھالیں۔ 48-1946ء کے دوران تحقیق کے لیے اڈنبرا یونیورسٹی (برطانیہ) میں مقیم رہے اور پروفیسر جیمس ڈریور کی نگرانی میں پی ایچ۔ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی۔ اس زمانے میں اڈنبرا یونی ورسٹی میں فلسفے سے نفسیات کو علاحدہ کر کے آزاد شعبہ قائم ہو چکا تھا۔ انگلینڈ میں تحقیق کے دوران علمِ نفسیات کے مختلف ماہرین کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ وہاں سے واپسی پر 1953ء میں شعبۂ نفسیات، پٹنہ یونی ورسٹی کے صدر مقرر ہوئے اور یہ سلسلہ 1974ء میں ملازمت سے سبک دوشی تک جاری رہا۔ اس کے بعد بھی پانچ برسوں تک یو۔جی۔سی۔ کی اسکیم کے تحت وہ پڑھاتے رہے۔

1933ء میں محسن صاحب کی شادی مولوی ضمیر الدین کی صاحب زادی محترمہ محفوظہ سے ہوئی۔ سیّد محمد محسن نے اپنے سبھی بچّوں کو اعلا تعلیم سے بہرہ مند کیا۔ 1973ء میں انھوں نے اہلیہ کے ہمراہ حجِ بیت اللہ کیا۔ 2 مارچ 1999ء کو دہلی میں ان کی وفات ہوئی۔

سیّد محمد محسن ماہرِ نفسیات تھے۔ انھوں نے بیش تر انگریزی میں لکھا لیکن اردو بھی ان کی توجہ سے محروم نہیں رہی۔ 1937ء میں ان کا نفسیاتی افسانہ "انوکھی مسکراہٹ" شائع ہوا۔ اس افسانے کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ 1973ء میں اسی عنوان سے ان کے افسانوں کا مجموعہ طبع ہوا۔ ان کی دیگر اردو کتابیں اس طرح ہیں۔ "نفسیاتی زاویے" (مجموعۂ مضامین)، "سعادت حسن منٹو، اپنی تخلیقات کی روشنی میں"، "جائزے" (مضامین)، "زخموں کے پھول" (شعری مجموعہ)، "لمحوں کا کارواں" (خودنوشت)۔ انھوں نے فرائڈ پر اردو میں کئی مضامین لکھے جن کا مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا۔ ترقی اردو بیورو نے ان کی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ "ابتدائی نفسیات" کے نام سے شائع کیا۔

سیّد محمد محسن

مختصر افسانہ

انوکھی مسکراہٹ

''کیا کر رہی ہو بیٹا؟'' بڈھے نے کھانستے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ اس کے دل کی غمناکی کے اثر سے جسے نا اُمیدیوں نے برف کی طرح سرد کر دیا تھا۔

''کُرتے میں پیوند لگا رہی ہوں باوا۔ کیا ہے؟'' جمنی نے باپ کے قریب آ کر کہا۔

''کچھ نہیں شام کے لیے چاول تو نہ ہوں گے۔ دو دن سے کوئی مُردہ نہیں آیا۔ اب صرف یہ اکنّی ہمارے پاس رہ گئی ہے۔ بیٹا جب تو بچّہ تھی اس وقت اسی قبرستان میں روز دو دو تین تین مُردے آیا کرتے تھے۔ دور دور تک کوئی اور قبرستان نہ تھا۔ مجھے دن دن بھر فرصت نہ رہتی۔ اکیلا آدمی، دفن کا سارا انتظام مجھی کو کرنا پڑتا تھا۔ پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ لیکن جو ملتا اُٹھا دیتا۔ اس دن کی خبر نہ تھی۔ ایک تو یہاں اب صرف غریبوں ہی کے مُردے آتے ہیں۔ لڑ جھگڑ کر ان سے کہیں دو چار پیسے وصول ہوتے ہیں۔ برس چھے مہینے میں کوئی امیر مسافر مر گیا اور اُس کے عزیز آ گئے تو کچھ رقم مل گئی۔ لیکن آج کل تو ایسا سناٹا ہے کہ دو دو چار چار دن کوئی مُردہ نہیں آتا۔ اب یہ آخری اکنّی رہ گئی ہے۔ کوئی پڑا ہو تو دو رات کے کھانے کے لیے بازار سے کچھ لیتا آؤں۔ کوئی آئے تو میرا انتظار کرانا۔ کہنا باوا ابھی آتے ہیں۔''

آخری جملے نے بڈھے کے سوکھے ہوئے چہرے پر ایک چمک پیدا کر دی۔ مستقبل کا تھوڑا سا کھنا امیدیوں میں گھرا کیوں نہ ہو، اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بڈھے نے اپنی لکڑی اٹھائی اور جھونپڑی سے نکل گیا۔ اس کے بدن پر ایک میلی جا بجا پیوند لگی سیاہ عبا تھی۔ اس کی کاکلیں لٹکی ہوئی تھیں اور لمبی سفید داڑھی بکھری ہوئی تھی۔ برسوں سے حجام نے انھیں ہاتھ نہ لگایا تھا۔ چہرے پر جھرّیاں پڑ گئی تھیں۔ کمر ضعف سے جھکی ہوئی تھی۔ ناطاقتی سے پیر چلنے میں ہلتے اور قدم مشکل سے جمتا تھا۔ وہ قبرستان کا مجاور تھا۔ قبرستان آبادی سے بہت دور تھا۔ سنسان میدان میں یا تو جا بجا کچھ پختہ قبروں پر ان کے نشان نظر آتے یا بڈھے کا افلاس زدہ جھونپڑا۔ مُردوں کی اس بستی میں صرف یہ دو زندہ جانیں رہتی تھیں۔ جمنی کی ماں اس کے بچپن میں مر چکی تھی۔ بڈھے نے پھر بیاہ نہ کیا۔ وہ جمنی کو بہت چاہتا تھا۔ اس دنیا میں اس کا جمنی کے سوا کوئی نہ تھا۔

جمنی باپ کے جاتے ہی پھر پیوند لگانے بیٹھ گئی۔ اسے بھی تعجب تھا کہ اب لوگ کیوں نہیں مرتے۔ ''اگر مُردے آنا بند ہو گئے تو اس کا باپ کیا کرے گا؟ دال چاول کہاں سے آئیں گے۔ وہ اپنے باپ کو پکا کر کیا دیا کرے گی؟''

وہ دیر تک سوچ نہ سکی۔ اس کا ذہن ابھی ان حالات پر غور کرنے کا اہل نہ بنا تھا۔ وہ تو ابھی تصوّرات کی دنیا میں رہتی تھی۔ اس کا سن ہی کیا تھا۔ اس کا دماغ صرف ماضی و مستقبل کی آزاد تصویریں پیش کر سکتا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ ''پار سال کیا اچھا زمانہ تھا جب سارے شہر میں طاعون پھیلا ہوا تھا۔ قبرستان میں دن بھر لاشوں کا تانتا لگا رہتا۔ اس کا باپ کتنا خوش نظر آتا تھا۔ باوجود دن رات کی مصروفیت کے۔ اپنے باپ کو کبھی اس نے اتنا خوش نہ دیکھا تھا۔ وہ اس کے لیے طرح طرح کی مٹھائیاں لاتا۔ اتنی مٹھائی اس نے کبھی نہ کھائی تھی۔ کسی تہوار میں بھی نہیں۔ اس کے اچھے کپڑے سب اسی زمانہ کے تھے۔ وہ گُرتہ بھی جس میں وہ پیوند لگا رہی تھی کیسا اچھا کپڑا تھا۔ اتنا پرانا ہونے پر بھی اس کی آب و تاب ویسی ہی تھی۔ اور وہ ساڑی جو اس نے عید پر پہنی تھی۔ اس کا باپ کہتا تھا کہ وہ ساڑی اسے بہت بھلی لگتی تھی۔ اب کے تہوار پر وہ پھر اسی ساڑی کو پہنے گی۔''

''جمنی!'' بڈھے نے جھونپڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے پکارا۔ اس کے کاکل اور داڑھی کے بال گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ چہرہ کی شکنوں میں خاک کے ذرّے بھر گئے تھے۔ جن سے چہرے کے نشیب و فراز میں کمی ہو گئی تھی۔ قدرت کا کریمانہ ہاتھ وقت کے تخریبی عمل پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بڈھے کے کاندھے پر دو چھوٹی چھوٹی گٹھریاں تھیں۔ ان کا وزن کچھ ایسا نہ ہوگا لیکن بڈھے کی کمر اور جھک گئی تھی۔ عمر کا بوجھ اس کی پیٹھ پر کب کم تھا کہ وہ اور زیادہ وزن برداشت کر سکتا۔ زندگی کا بھی وزن ہوتا ہے جو ہر سانس کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اخیر عمر میں کمر جھک جایا کرتی ہے۔

جمنی نے گٹھریاں باپ کے کندھے سے اُتار کر زمین پر رکھ دیں۔ بڈھا چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ چہرہ کا پسینہ اٹی ہوئی خاک کو گوندھ رہا تھا اور سانس کی تیز رفتار سے چہرہ میں جو حرکت پیدا ہو رہی تھی، اس سے بھیگی ہوئی خاک کے خُرد بینی پُتلے بن رہے تھے۔ فطرت کی تخلیق یہاں بھی جاری تھی۔

''بیٹا کوئی آیا تھا؟'' اس نے جمنی سے سوال کیا۔

''نہیں باوا۔'' جمنی نے کہا۔ اور باپ کی پھٹی ہوئی گفنی تہ کر کے الگنی پر ڈالنے لگی۔

''کوئی نہیں؟ اب ہماری قسمت بگڑ گئی ہے۔ ورنہ اتنی کم موت شہر میں شاید کبھی نہ ہوئی تھی۔ باپ دادا کا پیشہ ہے چھوڑا نہیں جاتا۔ پیالہ لے کر در بدر بھیک مانگنا تو اس سے بہتر ہوتا۔ پھر اپنی غیرت بھی گوارا نہیں کرتی۔ اس وقت لوگ مجھ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہر شخص شاہ صاحب شاہ صاحب کہتا ہے۔ بھیک مانگنے نکلوں گا تو جانے کون کس طرح پیش آئے۔ مگر اب اس پیشہ سے روٹی کیوں کر چلے گی۔ جوانی تو اس عیش میں گزری، اب بڑھاپے میں ایسی مصیبت یا اللہ!'' بڈھا یہ کہہ کر رونے لگا۔ آنسو کے دو بڑے بڑے قطرے گرد آلود چہرے پر اپنا نشان چھوڑ کر بڈھے کی داڑھی میں کھو گئے۔ باپ کو روتا دیکھ کر جمنی باپ کے گلے سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔ دنیا والے کسی کی موت پر روتے ہیں۔ یہ باپ بیٹی دنیا والوں کی زندگی پر آنسو بہا رہے تھے۔

رات کے دو بجے تھے۔ بڈھا چٹائی پر لیٹا کھانس رہا تھا۔ جمنی بے فکری کی نیند سے سو رہی تھی۔ رات نہایت تاریک اور بھیانک تھی۔ بڈھے کا دماغ مستقبل پر غور کرنے میں منہمک تھا۔ ''اس کے بعد دنیا میں جمنی کا کوئی نہیں۔ اس کی زندگی کس طرح گزرے گی؟ اگر وہ اسے بیاہنے سے پہلے مر گیا تو پھر اس کا بیاہ کیوں کر ہوگا۔'' اسے جمنی کا مستقبل نہایت تاریک نظر آنے لگا۔ رات کی تاریکی میں جھونپڑی کے اندر ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی ایک لو تھی۔ لیکن اس کے دماغ کے اندھیارے میں کہیں روشنی کا نشان نہ تھا۔

''شاہ صاحب!'' ماحول کی بسیط خاموشی کو چیرتی ہوئی ایک آواز اس کے کان میں پہنچی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ جھونپڑی کے باہر ایک شخص اسے پکار رہا تھا۔

''کون ہے؟ مجھ کو بلاتے ہو۔ کیا کام ہے؟''

''دلّی والے سوداگر کے لڑکے کا انتقال ہو گیا۔ جنازہ صبح سویرے یہاں آئے گا۔ آپ قبر وغیرہ کا انتظام درست رکھیے۔''

''دلّی والے سوداگر کا نام سن کر بڈھے کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ یہ ایک پردیسی بڑے تاجر تھے۔ بڈھے کو روپے کافی مل جائیں گے۔ غایت مسرت میں اس نے رات کا باقی حصہ آنے والے روپیوں کی چمک اور چھنک کے تصور میں جاگ کر گزار دیا اور صبح سے پہلے قبر کے انتظام میں جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔ اس کی سوکھی ہوئی ٹانگوں میں پھرتی آ گئی تھی اور کمر کی خمیدگی میں کچھ کمی۔ مسرت و انبساط میں ہی قوت و توانائی کا راز مضمر ہے۔ اس کا لگاؤ مستقبل کے خیالی شہ پاروں ہی سے کیوں نہ ہو۔

جمنی صبح اٹھ کر جھونپڑی میں جھاڑو دے رہی تھی۔ باہر سے کچھ لوگوں کے گزرنے کی آواز آئی۔ جمنی دروازے پر آ کر دیکھنے لگی۔ بہت سارے آدمی ایک جنازہ کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ کچھ لوگ آپس میں باتیں کرتے جا رہے تھے۔

ایک نے کہا: ''کیسا کڑیل جوان تھا۔''

دوسرے نے جو قریب ہی سے جنازہ کے ساتھ ہو گیا تھا، سوال کیا: ''آخر اس بے چارے کو ہوا کیا تھا؟''

''کیا بتائیں بھائی۔'' پہلے نے جواب دیا۔ ''ایک عورت سے اس کا کچھ دنوں سے تعلق تھا۔ اس چڑیل نے اپنے ایک آشنا کے بہکانے سے کل رات اس بیچارے کو زہر دے دیا۔ دن بھر اس کی حالت خراب رہی اور آخر سہ پہر سے پہلے رخصت ہو گیا۔ افسوس، میرا بڑا دوست تھا۔''

جمنی ان کی گفتگو بڑے غور سے سنتی رہی اور جب وہ کچھ آگے نکل گئے تو جنازے پر نظریں جمائے بے اختیارانہ ہنسنے لگی اور پھر جھونپڑی کے اندر جا کر جانے کب تک ہنستی رہی۔ جھاڑو دینے میں آج اسے ایک خاص لذت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اور دن جلد جلد جھاڑو دے کر دوسرے کاموں میں مصروف ہو جایا کرتی لیکن آج اس کا جی چاہتا تھا کہ برابر جھاڑو دیتی رہے اور ساتھ ہی ہنستی جائے۔ آج اس کے جھاڑو دینے کے انداز میں رقص کی کیفیت تھی۔ جھاڑو کی حرکت اور کمر کی جنبش میں ایک انوکھی ہم آہنگی تھی۔

بڈھا قبرستان سے جھونپڑی میں آیا تو اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ چہرے پر غایت انبساط سے ایک ہلکا گداز پیدا ہو گیا تھا۔ جس سے چہرے کی شکنوں میں پھیلاوٗ آ گیا تھا۔ بڈھے کا مُردہ شباب اپنے اعادہ کی کوشش کر رہا تھا۔ مسرّت کی برقی رَو نے اس میں جان ڈال دی تھی۔ انسان اگر ہمیشہ مسرور ہی رہتا تو وہ کبھی بڈھا نہ ہوتا۔ لیکن پھر مسرّت بھی تو بے معنی و بے اثر ہو جاتی۔ بڈھے کو روپے کافی مل گئے تھے۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے انھیں جمنی کے حوالے کیا۔ جمنی نے ایک سال سے اتنے روپے نہ دیکھے تھے۔ دیر تک ہتھیلی پر رکھے انھیں دیکھتی رہی۔ چاندی کے سکّوں کی تابانی اس کے چہرے پر چمک پیدا کر رہی تھی۔

''جمنی!'' حنیف نے باہر سے آواز دی۔ اس کے ہاتھ میں ڈاک کا تھیلا تھا۔ ہر ہفتہ اُسے پاس کی بستی میں ڈاک لے جانا ہوتا تھا۔ آتے جاتے وہ اکثر بڈھے کے یہاں کچھ دیر بیٹھ جاتا۔ جمنی اپنے باپ کے علاوہ صرف حنیف کو جانتی تھی۔ وہ اس سے بے باکانہ باتیں کرتی۔ وہ سوسائٹی کی ان رُکاوٹوں سے آزاد تھی جنھیں شرم و حجاب کا نام دے دیا جاتا ہے۔ حنیف جوان تھا۔ خوبصورت بدن، لانبے قد والا۔ بڈھے کو اس سے اس قدر انس ہو گیا تھا کہ جمنی سے اس کا آزادانہ ملنا اسے ناگوار نہ ہوتا۔

''کیوں؟ شاہ صاحب کہاں ہیں؟''

''بازار گئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔ تم اس ہفتہ نہ آئے تھے۔ میں تمھاری راہ دیکھتی رہی۔ بابا بھی پوچھ رہے تھے۔''

''اس دن میں چھٹی لے کر گھر چلا گیا تھا۔ تم راہ کیوں دیکھتی رہیں۔ کیا کوئی کام تھا؟''

''نہیں تو یوں ہی پوچھ لیا۔ گمان ہوا کہ شاید تم بیمار پڑ گئے۔ نہیں آنا تھا تو پہلے کہہ دیتے۔ ہم لوگوں کو کچھ خیال نہ ہوتا۔''

''گھر سے بھائی کی ایکا ایکی چٹھی آ گئی، وہ بیمار ہو گئے تھے۔ اُسی دن چھٹی کی درخواست منظور کرا کر چلا گیا۔ تمھاری طرف آنے کا وقت نہ ملا۔ کیا تم دن بھر انتظار کرتی رہیں؟''

حنیف کی گفتگو میں محبت کی حلاوت تھی۔ اس کی آنکھیں اس کا راز فاش کر رہی تھیں۔ حنیف کو جمنی سے محبت تھی۔ اتھاہ۔ گو اس کا احساس ان دونوں میں سے کسی کو نہ ہوا تھا۔ محبت اپنا پہلا وار چوری سے کیا کرتی ہے۔ اس طرح کہ محبت کرنے والے کو اس کی تمیز نہیں ہوتی۔ پھولوں کی مار سے چوٹ لگتی ہے لیکن اس چوٹ کا احساس چوٹ کی طرح نہیں ہوتا۔

''کیوں انتظار کرتی رہتی؟ کیا کوئی دوسرا کام کرنے کو نہ تھا۔''

جمنی کے جواب میں شوخی و شرارت کی آمیزش سے ایک دل کش لوچ پیدا ہو گیا تھا۔ حنیف اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''اچھا اب جانا ہے۔ بہت سی ڈاک باقی رہ گئی ہے۔ شاہ صاحب کو میرا اسلام کہہ دینا۔''

بڈھا بخار سے ہانپ رہا تھا۔ جمنی سرہانے بیٹھی اس کا سر دبا رہی تھی۔ بڈھے کو دو دن سے بخار تھا، شدت کی کھانسی کے ساتھ۔ اس سنسان آبادی میں کوئی نہ تھا کہ بڈھے کے لیے کہیں سے دوا لا کر دیتا۔ بڈھے کا بخار بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ دماغ پر اثر ہو گیا۔ جمنی نے آج تک کسی کو بیمار ہوتے نہ دیکھا تھا۔ اس کی ماں اس کے بچپن میں مر گئی تھی اور اس کا باپ کبھی اس طرح بیمار نہ ہوا تھا۔ اسے خبر نہ تھی کہ اس بیماری کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے۔ ہاں بڈھے کی تکلیف دیکھ کر اسے بے چینی ہو رہی تھی۔ وہ باپ کو "باوا، باوا" کہہ کر آواز دیتی اور جب کوئی جواب نہ ملتا تو اسے ایک غم آلود حیرانی و استعجاب ہو جاتا۔ اُسے کیا خبر تھی کہ بڈھا دم توڑ رہا تھا اور جس طرح اس نے اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے سورماؤں کو زمین کے نیچے چھپا دیا تھا، اس کا نشان بھی خاک کے اندر کھودیا جانے والا تھا۔ صبح ہوتے ہوتے بڈھے کی روح پرواز کر گئی۔ جمنی نے مُردے ہزاروں دیکھے تھے لیکن کفن کے اندر ڈھکے ہوئے، موت کا منظر اس نے پہلی بار دیکھا۔ اس کے باپ کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں، سانس کی آمد و رفت بند ہو چکی تھی، بدن سرد ہو گیا تھا۔ باپ کی حالت دیکھ کر اس کے دل میں گداز پیدا ہوا اور وہ بے اختیارانہ رونے لگی۔ اس لیے نہیں کہ اُس کا باپ اس سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا بلکہ اس لیے کہ وہ اپنے باپ کی اس غیر معمولی حالت کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس کے آنسو اس کے فہم و ادراک کی مجبوری کا اظہار تھے۔

صبح کو حسب معمول حنیف ڈاک کا تھیلا لیے جھونپڑی میں داخل ہوا۔ جمنی اُسے دیکھ کر مُسکرا دی۔ وہ دیر سے حنیف کی منتظر تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کے باپ کی اس غیر معمولی کیفیت کا راز اسے بتا سکے گا۔ حنیف سے اس نے بارہا مختلف باتوں کی بابت سوال کیا تھا اور اس نے برابر اس کی تشفی کر دی تھی۔

"دیکھو تو باوا کو کیا ہو گیا ہے؟"

حنیف نے بڈھے کے قریب جا کر دیکھا۔ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اس کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکل آئے۔ جمنی بھی رونے لگی۔

"شاہ صاحب سدھار گئے۔ ان کے دفن کا سامان کرنا چاہیے۔" حنیف نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور جھونپڑی سے باہر چلا گیا۔ کچھ دیر میں حنیف چند آدمیوں کو ساتھ لے کر آیا۔ جنازہ تجہیز و تکفین کے بعد قبرستان لے جایا جانے لگا تو جمنی کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ مسکرانے لگی اور جب تک جنازہ اس کی نظروں کے سامنے رہا مسکراتی رہی۔ جنازہ دفن ہو چکا تو ایک بارگی اس پر افسردگی چھا گئی۔ قبرستان سے لوٹنے والوں میں اس کا باپ نہ تھا۔ یہ اُس کے لیے ایک غیر معمولی مشاہدہ تھا۔ اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں اور مسکراہٹ کی جگہ آنسوؤں کی دو بڑھتی ہوئی دھاروں نے لے لی۔

حنیف جمنی کو اپنے گھر لے گیا اور دونوں کا بیاہ ہو گیا۔ جمنی کے لیے حنیف کا گھر ایک نئی دنیا تھی۔ وہ پہلے صرف اپنے باپ اور حنیف کو جانتی تھی۔ عورت و مرد کا فرق تک اس نے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ اُسے کسی عورت سے سروکار نہ رہا تھا۔ یہاں اُسے بہتیرے عورتوں سے واسطہ تھا۔ قبرستان کے ماحول کے لیے جمنی اپنے باپ کے ساتھ مر چکی تھی اور جس طرح اس کا باپ اس دنیا سے گزر کر ایک دوسرے عالم میں پہنچا ہوا تھا۔ جمنی بھی ایک عالم سے منتقل ہو کر دوسری دنیا میں بس رہی تھی۔ ہم اس زندگی میں بھی

کتنی بار مر کر جیتے ہیں۔ جوانی کا نمو د بچپن کی موت سے ہوتا ہے۔ بڑھاپے کی آمد جوانی کے لیے پیامِ مرگ ہے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں لوگ موت کے بعد کی زندگی پر یقین نہیں رکھتے۔ حنیف جمنی کو دیوانہ وار چاہنے لگا۔ وہ اُس سے ایک منٹ کو علیحدہ ہونا گوارانہ کرتا تھا۔ جمنی بھی حنیف کی عدم موجودگی میں بے قرار سی رہتی۔

ہم سایہ کا لڑکا شب کو مر گیا۔ جمنی کو صبح سویرے خبر ملی۔ وہ جلد جلد گھر کا کام کر کے ہم سایہ کے ہاں جانے لگی۔ وہ آج بہت خوش تھی، اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ لیکن اس کی دلکشی وجاذبیت کم ہوگئی تھی۔ حنیف اس کی مسرت کا سبب نہ سمجھ سکا۔ جس وقت وہ ہم سایہ کے یہاں جارہی تھی حنیف نے اس سے سوال کیا۔

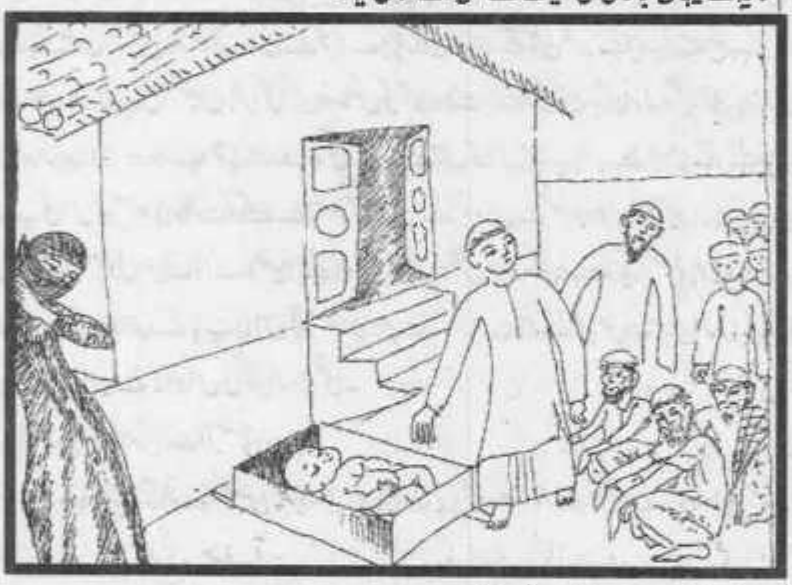

"کیوں آج تم بہت خوش معلوم ہوتی ہو؟"

جمنی نے کوئی جواب نہ دیا اور مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ حنیف کے دل ودماغ پر جمنی کی محبت اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ وہ جمنی کے سامنے کچھ سوچ نہ سکتا تھا۔ اس بے معنی تبسم پر اس نے جمنی کے جانے کے بعد کوئی غور نہ کیا۔

جمنی ہم سایہ کے ہاں گئی تو بچہ کی لاش کو اس وقت کفنایا جارہا تھا۔ وہ ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ اس منظر سے لذت حاصل کر رہی تھی۔ برابر کی ایک عورت نے جمنی کی اس کیفیت کو دیکھ لیا۔ لیکن وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ جمنی ان سبھوں میں بہت ہردلعزیز تھی۔ اس کے خلاف کسی کو کسی طرح کا گمان نہ ہوسکتا تھا۔

محلہ میں کوئی موت ہوتی تو جمنی وہاں ضرور پہنچتی اور دور دور کھڑی ہو کر مسکراتی رہتی۔ اُس کی اِس انوکھی مسرت کا ہر جگہ چرچا ہونے لگا اور محلہ والیاں اُسے مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔ حنیف کو بھی اس کی بھنک ملتی رہتی۔ وہ جمنی سے اس کی بابت سوال کرتا تو جمنی مخبوط وسراسیمہ سی ہو جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ایک بے گناہ پر جرم کا الزام لگایا جارہا ہے۔ حنیف نے جمنی کو تاکید

کردی کہ وہ آئندہ کسی کی موت کی خبر سن کر وہاں نہ جایا کرے۔ جمنی نے اس کا وعدہ بھی کر لیا لیکن جب کبھی اُسے موت کی خبر ملتی اس کے قدموں میں بجلی کی سی پھرتی آجاتی اور وہ غیر ارادانہ گھر سے نکل جاتی۔ حنیف کو جمنی سے کچھ خوف پیدا ہونے لگا تھا۔

جمنی کا بچہ تین دن سے بیمار تھا۔ جمنی دن رات اس کی خدمت میں مصروف تھی۔ ڈاکٹر نے نمونیہ تجویز کیا۔ حنیف نے دوا کی دو شیشیاں جمنی کو لا کر دیں۔ ایک کھانے کی اور دوسری سینہ پر مالش کرنے کی۔ مالش کرنے والی دوا پر پوائزن کی چٹ لگی تھی۔

''اس دوا کو الگ رکھنا اس میں زہر ہے۔'' حنیف نے جمنی سے کہا۔ جمنی نے دوا الگ طاق میں رکھ دی۔ بچہ کی حالت شام تک کچھ سنبھلنے لگی۔ بخار میں کمی اور کھانسی میں تخفیف ہوگئی۔ جمنی تین شب سے نہ سوئی تھی۔ بچہ کے پہلو میں بیٹھی سوگئی۔

آدھی رات کو جمنی ایک خواب دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی جھونپڑی کے دروازہ پر کھڑی ہے۔ اس کا باپ قبرستان میں ہے۔ سامنے سے کچھ لوگ ایک لاش کاندھے پر اٹھائے قبرستان کو جا رہے ہیں اور آپس میں گفتگو کر رہے ہیں۔ ''ایک عورت نے اس بے چارے کو زہر پلا دیا۔'' جمنی یکا یک بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پر موت کا سا پیلا پن لگا۔ آنکھیں باہر کو نکل آرہی تھیں۔ لبوں پر تھرتھراہٹ کے ساتھ ایک خوفناک مسکراہٹ تھی۔ اس کے اعضا کڑے ہو رہے تھے۔ اس کی مُردہ سی ٹانگوں میں یکا یک جنبش پیدا ہوئی۔ اس نے طاق کی طرف تیزی سے قدم بڑھایا اور زہر والی شیشی کو جھپٹ کر ہاتھ میں لے لیا۔ اس کا چہرہ اور بھیانک ہوگیا۔ موت کا فرشتہ اس کے جسم میں حلول کر گیا تھا۔ شیشی مٹھی میں جکڑے وہ نہایت سرعت سے بچہ کے قریب آئی اور اس کے نازک جبڑے اپنے دونوں ہاتھوں سے کھول کر جن میں آہنی سلاخوں کی سی سختی آگئی تھی، شیشی کی ساری دوا بچہ کے منہ میں انڈیل دی اور کھلکھلا کر ہنستی ہوئی بستر پر گر گئی۔ وہ جلد ہی سوگئی۔ کچھ دیر بعد بچہ کے کراہنے سے اس کی نیند ٹوٹی۔ بچہ کرب و اذیت سے تڑپ رہا تھا۔ آنکھیں پتھرا رہی تھیں۔ سارے جسم میں تشنج تھا۔ بچہ کی حالت دیکھ کر جمنی نے اسے کلیجہ سے لگا لیا اور ڈھاڑیں مار کر رونے لگی۔ حنیف قریب ہی سویا تھا۔ اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ بچہ کی حالت اخیر تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ بے جان ہوگیا۔ صبح کی روشنی میں حنیف کی نظر زہر کی خالی شیشی پر پڑی جو بچہ کے سرہانے پڑی تھی۔

''تم نے بچے کو دوا رات کس وقت دی تھی؟'' حنیف نے غضب ناک ہو کر پوچھا۔

''میں تو شام سے سوئی تھی۔ اٹھی تو اس کی یہ حالت تھی۔'' جمنی نے سسکتے ہوئے کہا۔

''پھر یہ خالی شیشی یہاں کہاں سے آئی؟'' حنیف نے شیشی ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

جمنی کی نظر شیشی پر پڑی۔ اسے خود حیرت تھی کہ اسے طاق میں سے کون لایا تھا۔ جمنی کا استعجاب دیکھ کر حنیف کا سر چکرانے لگا۔ اس کا دماغ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ زہر کی شیشی اس نے طاق میں رکھ دی اور بے ہوش ہو کر بستر پر گر گیا۔ صبح کو محلّہ والیاں بچہ کی خیریت پوچھنے آئیں تو ایک طرف حنیف بستر پر پڑا تھا، دوسری طرف جمنی غم سے چور بچہ کو دیوانہ وار چھاتی سے لگائے بیٹھی تھی۔ بچہ کی موت پر کسی کو تعجب نہ تھا۔ بچہ کی حالت دن میں ہی غیر تھی۔ محلّہ والوں نے مل کر بچہ کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ حنیف کو ہوش نہ تھا۔ سبھوں نے سمجھا کہ پہلی چوٹ لگی ہے، غم سے چور ہو رہا ہے۔ بچہ کی لاش جب قبرستان کو لے جانے لگے

تو جمنی یک بارگی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی نظریں جنازے پر لگی تھیں اور چہرے پر وہی پراسرار تبسم تھا۔

حنیف بستر پر گرا تو پھر نہ اُٹھا۔ جمنی اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک ہیبت ناک دیونی کی صورت ہر وقت گھومتی رہتی۔ اسے ایسا معلوم ہوتا کہ جمنی اس کا گلا دبا رہی ہے اور وہ یکبارگی چیخ اٹھتا۔ جمنی کی بے معنی مسکراہٹ اس کے دل و دماغ میں چبھ رہی تھی۔ اس کے جسم میں خوف و ہراس سے شدت کا لرزہ رہتا۔ اس کے حواس کسی وقت بجا نہ ہوتے تھے۔ اس کا بھائی اس کی بیماری کی خبر سُن کر آ گیا۔ اس نے سارے جتن کر ڈالے لیکن حنیف کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی گئی۔ جمنی غم سے گھل کر آدھی ہوگئی تھی۔ آخر ایک دن، رات کے دو بجے حنیف کی حالت بالکل غیر ہوگئی۔ اس کا بھائی سرہانے بیٹھا رو رہا تھا۔ جمنی الگ منہ چھپائے رو رہی تھی۔ حنیف کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ''جمنی ڈائن ہے۔ اس سے مجھ کو بچاؤ، یہ مجھ کو کھا جائے گی۔ زہر اس نے زہر ..... '' اتنا کہنے پر اس کی آواز بند ہوگئی اور اس کا بدن ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہوگیا۔ حنیف کے بھائی نے اُس کے ہذیان پر اتنی توجہ نہ کی۔ وہ بچوں کی طرح ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ صبح کو حنیف کی لاش تجہیز و تکفین کے بعد قبرستان لے جانے لگے تو جمنی پر وہی غیر معمولی تبسم کھیل رہا تھا۔ وہی ڈراؤنی ہنسی۔ موت کی دیوی کو اگر کبھی ہنسی آتی ہوگی تو اس کا تبسم بھی ایسا ہی ہیبت ناک ہوگا۔ حنیف کے بھائی نے جمنی کی مسکراہٹ دیکھ لی۔ اس کا دماغ فوراً حنیف کے آخری الفاظ کی طرف منتقل ہوگیا۔ دفن سے واپس آیا تو اس نے جمنی کو بلا کر پوچھا۔ مُردار! شوہر کی موت پر مُسکراتی کیوں تھی؟''

جمنی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے سکوت اختیار کیا۔ حنیف کے بھائی کو یقین ہوگیا کہ جمنی نے حنیف کو زہر دے دیا۔ خبر اُڑتی پڑتی تھانہ تک پہنچ گئی۔ پولس تفتیش کے لیے آ گئی۔ حنیف کے بھائی نے حنیف کا موت کے قبل کا بیان اور جنازہ کو دیکھ کر جمنی کا اظہار مسرت یہ دونوں باتیں پولس کو بتا دیں۔ جمنی حراست میں لے لی گئی۔ مکان کی تلاشی ہوئی۔ طاق میں زہر کی خالی شیشی موجود تھی۔ پولس کے نزدیک گمان و شبہ کی کوئی گنجایش نہ رہی۔

جمنی پر خون کا مقدمہ چلایا گیا۔ واقعات متعلقہ جرم کو ثابت کرنے کے لیے کافی تھے۔

جمنی کو قیدِ دوام کی سزا ہوگئی۔

جمنی اب تک قید خانہ میں زندگی کے دن گزار رہی ہے۔ وہ بہت اداس و غمگین رہتی ہے۔ لیکن اب بھی جب اس کی نظر کسی قیدی کی میت پر پڑ جاتی ہے تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے اور دیر تک دیوانہ وار ہنستی رہتی ہے۔

لفظ و معنی

عزیز - پیارا، نزدیک کا رشتہ دار

عبا - ایک عربی پوشاک، جبہ، چغہ

ضعف - کمزوری، بے ہوشی

مجاور - قبروں کی دیکھ بھال کرنے والا، زیارت کرانے والا، مُزوِّر

افلاس - غریبی، مفلسی

تانتا - قطار، بھیڑ، مجمع

نشیب وفراز - نیچ اونچ، اتار چڑھاو

کریمانہ - گرم اور مہربانی کا، فیاضانہ، سخی کے مانند

تخریبی عمل - بگاڑنے والا کام، تعمیری عمل کی ضد

خردبینی - خردبین کے سہارے باریک چیزوں کو دیکھنا (جنھیں ننگی آنکھوں سے نہ دیکھا جاسکتا ہو)

تخلیق - پیدا کرنا، بنانا، خلق کرنا

منہمک - کسی کام میں پوری توجہ سے لگا ہوا، کسی کام میں بہت مصروف

بسیط - بچھا ہوا، خالص، بے آمیزش، کشادہ

غایت مسرّت - بہت خوشی، حد درجہ خوش ہونا، انتہائی مسرّت

خمیدگی - ٹیڑھا پن، جھکاو، خم، کجی

مُضمر - چھپا ہوا، پوشیدہ، مخفی، دل میں رکھا گیا

شہ پارہ - بہترین حصّہ، بہترین فن پارہ

آشنا - جانا پہچانا ہوا، شناسا، جان پہچان والا

گداز - پگھلا ہوا، نرم، ملائم، پگھلانے والا

شباب - جوانی

اعادہ - دہرانا، لوٹانا، بار بار کرنا

برقی رَو - بجلی کی ترنگ، لہر، بجلی کی رو

تابانی - چمک، تابش، نور، روشنی

اُنس - اپنا پن، محبت، اُنسیت، پیار، رغبت، میل جول

حلاوت - مٹھاس، شیرینی، ذائقہ

فہم وادراک - سمجھ داری، عقل مندی، سمجھ بوجھ

نمود - ظاہر ہونا، ظہور، علامت

پیامِ مرگ - موت کا پیغام

ہردل عزیز - سب کا پیارا، سب کا محبوب، سب کا پسندیدہ

مشتبہ - جس میں شک ہو، جس میں شبہ ہو، مشکوک

مخبوط وسراسیمہ - خوف زدہ، گھبرایا ہوا، بدحواس، خبطی، پاگل، دیوانہ

تخفیف	-	کمی، گھٹاؤ
جنبش	-	حرکت، گردش، ہلنا
جشن	-	خوشی کی محفل، خوشی کا دن
پُراسرار تبسم	-	معنی خیز مسکراہٹ، وہ مسکراہٹ جس کے پیچھے کوئی بھید چھپا ہو
ہیبت ناک	-	خوفناک، ڈراونا، مہیب
منتقل	-	ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے والا
سکوت	-	خاموشی
تفتیش	-	چھان بین، کھوج، تحقیقات، پوچھ تاچھ
حراست	-	گرفتاری، نظر بندی، قید، نگرانی
متعلقہ	-	متعلق کی تانیث، تعلق رکھنے والی

آپ نے پڑھا

- کہانی ''انوکھی مسکراہٹ'' ایک خاتون کی نفسیات کو اُجاگر کرتی ہے۔ وہ ایک گورکن کی لڑکی ہے۔ قبرستان میں آتے ہوئے مُردوں کو دیکھ کر وہ مسکرانے لگتی ہے کیوں کہ اس کے باپ کو مُردے دفن کرنے کے لیے پیسے ملیں گے۔ وہ خوب کھائے گی، اچھے اچھے کپڑے پہنے گی۔ موت پر خوش ہونا بڑی عجیب و غریب اور غیر فطری بات ہے لیکن کہانی پڑھ لینے کے بعد اس لڑکی (جمنی) کا خوش ہونا غیر فطری نہیں محسوس ہوتا۔ جمنی کی مسکراہٹ اس کہانی کی روح ہے جسے بجا طور پر سیّد محمد محسن نے ''انوکھی مسکراہٹ'' قرار دیا ہے۔
- محمد محسن نے جمنی کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو آزادانہ اور منطقی طور پر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ افسانہ نگار چوں کہ خود ماہرِ نفسیات ہیں، اس لیے انھوں نے ''انوکھی مسکراہٹ'' کو ایک شاہکار نفسیاتی کہانی بنا دیا ہے۔
- دوسری بہت سی کہانیوں کے برعکس ''انوکھی مسکراہٹ'' میں ایک بالکل جداگانہ ماحول کو پیش کیا گیا ہے۔ قبرستان، مُردے، کفن، دفن، گورکن، یہ ساری چیزیں کہانی کی فضا کو پُراسرار بنا دیتی ہیں۔ جمنی کی معنی خیز مسکراہٹ، بچپن میں ایک خاص حالت میں شروع ہوتی ہے اور آگے چل کر بھی جاری رہتی ہے۔ یہ مسکراہٹ غیروں کی موت پر بھی ہے اور اپنوں کی وفات پر بھی۔ یہ مسکراہٹ آغاز میں معیشت سے تعلق رکھتی ہے لیکن آگے چل کر یہ سرشت کا حصّہ بن جاتی ہے اور ایک نفسیاتی مسئلے کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔
- ''انوکھی مسکراہٹ'' سیّد محمد محسن کا پہلا افسانہ ہے اور سب سے زیادہ مقبول بھی ہے۔ یہ سہل اور سادہ اسلوب میں لکھا گیا نہایت پُر اثر افسانہ ہے۔ بچپن میں دوسروں کی میت کو دیکھ کر مسکرانے والی بچی شادی کے بعد بھی اپنی اس عادت سے باز نہیں آتی۔ وہ پاس پڑوس کیا، اپنے بچے اور شوہر کی میت دیکھ کر بھی مسکراتی ہے۔ نتیجے کے طور

پر وہ شک کے دائرے میں آجاتی ہے اور قتل کے الزام میں گرفتار ہو کر قید دوام کی سزا پاتی ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے یہ باور کرانا چاہا ہے کہ سب کے سب جمنی کی پُر اسرار مسکراہٹ کو دیکھتے ہیں اور اسے سنگین جرم کا مرتکب ثابت کرتے ہیں لیکن کوئی اس کے نفسیاتی احوال اور مسائل کو سمجھنا نہیں چاہتا۔ وہ ایک نفسیاتی مریضہ ہے۔ اس کی بے بسی اور بے چارگی ناگفتہ بہ ہے۔ اس لیے وہ ہر طرف سے مصائب کی مار سہتی ہے لیکن اُف تک نہیں کرتی۔

- اس کہانی کا نہایت ہی المناک حصّہ وہ ہے جہاں گورکن یہ کہتا ہے کہ اب ہماری قسمت بگڑ گئی ہے۔ ورنہ اتنی کم موت شہر میں شاید کبھی نہ ہوئی تھی۔ گورکن کی یہ بات بہ ظاہر بہت ناگوار اور اوچھی ہے۔ موت کی تمنا کرنا حیوانی سوچ کی دلیل ہے لیکن میّت نہیں آنے کے سبب جس غربت اور تنگ حالی سے باپ بیٹی کو گزرنا پڑتا ہے، وہ حد درجہ دردناک اور قابلِ رحم ہے۔ وہ زار و قطار روتے ہیں اور دنیا والوں کی زندگی پر آنسو بہاتے ہیں۔ کہانی میں ان دو موقعوں کو پیش کر کے افسانہ نگار نے ہمیں کشمکش میں ڈال دیا ہے کہ ہم بڈھے گورکن کی بات کو غلط مانیں یا اس کے حالات کو۔

کچھ اور باتیں

- اس کہانی میں دو مرکزی کردار ہیں۔ گورکن اور اس کی بیٹی جمنی۔ اس کے علاوہ حنیف اور اس کے بھائی کا بھی کردار ہے لیکن پوری کہانی اوّل الذکر دو کرداروں کے اِرد گرد ہی گھومتی ہے۔ ڈرامے کی طرح کہانی میں بھی مکالموں سے اہم کام لیا جاتا ہے۔ ''انوکھی مسکراہٹ'' کے مکالمے چست اور حسبِ حال ہیں۔ قبرستان کے مناظر اور بوڑھے کی جھونپڑی کے حالات وقت کی رفتار کے ساتھ بدلتے ہیں۔ گہما گہمی سناٹے میں بدلتی ہے۔ خوشی تکلیف اور مشکلات کا شکار ہو جاتی ہے۔
- ''انوکھی مسکراہٹ'' جیسے نفسیاتی افسانے اردو میں زیادہ نہیں لکھے گئے۔ ممتاز مفتی، آغا بابر، علی عباس حسینی، سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ کے یہاں اس انداز کے افسانے ملتے ہیں۔ اس قبیل کی کہانیوں کے ذریعے کرداروں کے داخل میں اُتر کر افسانہ نگار ان کی سرگرمیوں کو باریکی سے سمجھنے اور ان سے نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کہانیوں کے ذریعے زندگی کی ان گہرائیوں تک ہماری رسائی ہو پاتی ہے جہاں تک ہم خود سے بہ آسانی نہیں پہنچ سکتے۔

آپ بتائیے

1- سیّد محمد محسن کس طرح کے افسانہ نگار تھے؟
2- اُن کی سب سے مشہور کہانی کون سی ہے؟
3- شادی سے قبل جمنی کہاں اور کس کے ساتھ رہتی تھی؟
4- جمنی کا باپ کیوں زار و قطار رونے لگا؟

5- جمنی مُردے دیکھ کر کیوں ہنستی تھی؟

6- حنیف کی موت کن حالات میں ہوئی؟

7- حنیف نے ڈائن کس کو کہا اور کیوں کہا؟

8- اس افسانے میں کون کون سے کردار آئے ہیں؟

9- یہ کہانی کس وجہ سے اہمیت کی حامل ہے؟

10- سید محمد محسن کے افسانوی مجموعے کا کیا نام ہے؟

درج ذیل سے مناسب جواب منتخب کیجیے

(i) جمنی کا باپ کیا کرتا تھا؟

(الف) مزدوری (ب) تجارت (ج) کاشت کاری (د) مجاوری

(ii) جمنی کے شوہر کا کیا نام تھا؟

(الف) شریف (ب) حنیف (ج) نفیس (د) عزیز

(iii) جمنی کا شوہر کیا تھا؟

(الف) گورکن (ب) سپاہی (ج) ڈاکیہ (د) کسان

(iv) بوڑھا مجاور کس مرض سے مرا؟

(الف) دمہ (ب) بخار (ج) چیچک (د) پلیگ

(v) حنیف کا بچہ کیسے مرا؟

(الف) تپ دق سے (ب) گرنے سے (ج) زہر سے (د) بھوک سے

(vi) جمنی کے خلاف تھانے میں رپورٹ کس نے کی؟

(الف) حنیف کے باپ نے (ب) حنیف کے دوست نے

(ج) حنیف کے بھائی نے (د) حنیف کے پڑوسی نے

(vii) جمنی کس الزام میں جیل گئی؟

(الف) قتل (ب) چوری (ج) زنا کاری (د) مار پیٹ

دیے گئے الفاظ کی ضد لکھیے:

شام مُردہ مصیبت مشکل مستقبل

صحیح جوڑے ملایئے:

(1) کوئی آئے تو میرا انتظار کرانا	(i) بڈھا چٹائی پر لیٹا کھانس رہا تھا
(2) اگر مُردے آنا بند ہو گئے تو اس کا باپ کیا کرے گا	(ii) جنازہ صبح سویرے یہاں آئے گا
(3) رات کے دو بجے تھے	(iii) وہ بہت اُداس اور غمگین رہتی ہے
(4) دلّی والے سوداگر کا لڑکا مر گیا	(iv) دال چاول کہاں سے آئیں گے
(5) جمنی اب قید کی زندگی گزار رہی ہے	(v) کہنا کہ باوا ابھی آتے ہیں

اس افسانے میں

- ''کیا کر رہی ہو بیٹا'' بڈھے نے کھانستے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ اس کے دل کی غمناکی کے اثر سے، جسے ناامیدیوں نے برف کی طرح سرد کر دیا تھا۔''

اس اقتباس سے ''انوکھی مسکراہٹ'' کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس سے صورت حال کی صحیح ترجمانی کا کام لیا گیا ہے۔ سیّد محمد محسن نے اس مایوسی بھرے حالات کے ذریعہ کس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مختصراً لکھیے۔

- ''پارسال کیا اچھا زمانہ تھا۔ جب سارے شہر میں طاعون پھیلا ہوا تھا۔ قبرستان میں دن بھر لاشوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔'' ان جملوں کی تشریح کیجیے۔
- ''رات کے دو بجے تھے۔ بڈھا چٹائی پر لیٹا کھانس رہا تھا، جمنی بے خبری کی نیند سو رہی تھی۔ رات نہایت تاریک اور بھیانک تھی۔ ان جملوں میں منظر نگاری کی گئی ہے۔ افسانے میں منظر نگاری سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ سو لفظوں میں لکھیے۔
- اس افسانے میں بوڑھے اور مفلوک الحال باپ کی لاچاری بیان کی گئی ہے ساتھ ہی ایک ایسی لڑکی کی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے جو موت کو خوشی کے طور پر لیتی ہے۔ ان دو حالات کو پیش کر کے افسانہ نگار نے افسانے کی تخلیق کی ہے۔ اس افسانے کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے؟ سو جملوں میں لکھیے۔

آیئے، کچھ کریں

1- سیّد محمد محسن کی کتابوں کو اپنی لائبریری میں تلاش کر کے ان کا مطالعہ کیجیے۔

2- سیّد محمد محسن کی حیات اور شخصیت پر اگر کوئی کتاب بازار میں مل جائے یا اسکول کی لائبریری میں موجود ہو تو اسے حاصل کر کے پڑھیے۔

3- سیّد محمد محسن کی حیات اور تصانیف کو ایک چارٹ پیپر میں دکھایئے۔

طارق چھتاری

طارق چھتاری یکم اکتوبر 1954ء کو ضلع بلند شہر کے چھتاری قصبے میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے اعلا تعلیم حاصل کرنے کے بعد آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام اکزیکیٹو کے طور پر تقریباً دس برسوں تک کام کیا۔ 1993ء میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوئے جہاں اب پروفیسر ہیں۔ "جدید افسانہ (اردو، ہندی)" ان کی تحقیقی کتاب ہے۔ 2001ء میں "باغ کا دروازہ" عنوان سے ان کے 19 افسانوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا۔

1970ء کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقی سرگرمیاں شروع کیں ان میں طارق چھتاری نے کم لکھنے کے باوجود اپنی شناخت قائم کی۔ علامتوں کا سلجھا ہوا استعمال ان کے افسانوں کو روایت سے الگ کرنے کے باوجود قابل مطالعہ بناتا ہے۔ زبان کی سطح پر محتاط رویہ انھیں دوسرے ہم عصروں سے امتیاز عطا کرتا ہے۔ طارق چھتاری تجربہ پسند افسانہ نگار ہیں۔ کلاسیکیت سے بھی انھیں شغف ہے اور اُن کی تخلیقات میں اس شعور کا اکثر و بیشتر استعمال ملتا ہے۔

'نیم پلیٹ'، 'گلوب'، 'ترسیان'، 'چابیاں'، 'صبح کاذب'، 'آن بان'، 'باغ کا دروازہ' اور 'لکیر'—— اُن کے مشہور افسانے ہیں۔ فکشن کے تعلق سے اُن کے حرف مضامین توجہ کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔

طارق چھتاری کا تخلیقی طریقۂ کار اس طور پر دوسرے لکھنے والوں سے مختلف ہے کیوں کہ اُن کے یہاں جدیدیت کے آخری عہد کے افسانوی حربے بہت متوازن طریقے سے استعمال میں لائے گئے ہیں۔ اُن کے ہر افسانے میں استعاراتی زبان روایتی بیانیہ کی طرف ضرور بڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے لیکن وہ شفاف بیانیہ میں تبدیل نہیں ہوتی۔ اُن کے افسانوی موضوعات مختلف النوع ہیں۔ دیہی سماج کے مسائل ہوں یا شہری زندگی کے عتابات یا اقوامِ عالم کی ابتری؛ وہ ہر جگہ احتیاط کے ساتھ بہترین تجزیاتی ذہن کا استعمال کرتے ہوئے اپنے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ اُن کا سیاسی اور سماجی شعور نہایت بالیدہ ہے اور اس کا سلیقے کے ساتھ افسانوں میں استعمال ملتا ہے۔

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

باغ کا دروازہ

گرمیوں کی تاروں بھری رات نے گھر کے بڑے آنگن کو شبنم کے چھڑکاؤ سے ٹھنڈا کر دیا تھا۔ جیسے ہی دادی جان نے تسبیح تکیے کے نیچے رکھی، نوروز کود کر ان کے پلنگ پر جا پہنچا۔ ''دادی جان جب بھی شہزادے باغ کی رکھوالی میں ناکام ہو گئے تو چھوٹے شہزادے نے بادشاہ سلامت سے کیا کہا......؟''

''نوروز تو اب بڑا ہو گیا۔ کہانیاں سننا چھوڑ.....''

''دادی جان یہ کہانی کہاں ہے، یہ تو ہمارے ہی شہر کے باغ کا قصہ ہے۔ باغ کوٹھی والا باغ۔''

''ہاں میرے لال، یہ ہمارے شہر کی بھی داستان ہے اور ان شہروں کی بھی جو ہم نے نہیں دیکھے ہیں۔''

''کیا چھوٹا شہزادہ بھی باغ کی رکھوالی میں ناکام ہو جائے گا؟''

''اچھا سن................لیکن ہنکارے بھرتے رہنا۔''

''تو چھوٹے شہزادے گل ریز نے بادشاہ سلامت سے کہا۔ بابا حضور مجھے بھی ایک موقع دیجیے۔ بادشاہ نے لختِ جگر پر نگاہ کی اور بولے۔ نہیں جانِ پدر، شرط مشکل ہے اور تو عزیز۔ اگر تیرا پہرا بھی ناکام ہوا تو اس وطن کے آخری ستارے کو بھی شہر بدر ہونا پڑے گا۔ شہر خالی ہو چکا ہے۔ تیرے پانچوں بھائی بھی میری آنکھوں کو ویران کر گئے ہیں۔ باغ پر کسی دیو کا سایہ ہے، جو سخت نگہبانی کے باوجود صبح ہوتے ہوتے سارے چمن کو اجاڑ دیتا ہے۔ پہرے کی کامیابی پر آدھی بادشاہت دینے کا وعدہ ہے۔ مگر تجھے کیا؟ اے میرے خوش بخت فرزند تو تو پوری سلطنت کا مالک ہے۔ نہیں بابا حضور، میں نے بیڑا اٹھایا ہے، اب آپ حکم دیجیے۔ جیسی تیری مرضی، اور بادشاہ نے شہزادے گل ریز کو رخصت کیا۔ شہزادے نے اپنے ساتھ ایک چاقو اور شیشی میں پسی ہوئی سرخ

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

مرچیں لیں اور باغ کی سمت روانہ ہوا۔ باغ کے دروازے میں داخل ہو، دروازہ بند کر، پہرہ دینے لگا۔ جب رات آدھی ہوئی اور جھپکیاں آنے لگیں تو اس نے چاقو نکال، اپنی کنی انگلی تراش، اس میں مرچیں بھر لیں۔ نیند آنکھوں سے غائب ہوگئی اور سحر نمودار ہونے لگی۔ اسے یاد آیا کہ عرصہ ہوا اس باغ میں ایک فقیر نے ڈیرا ڈالا تھا اور کسی بات پر خوش ہو کر اس قلندر نے شہزادے کو بتایا تھا کہ اس باغ پر ایک دیو کا سایہ ہے۔ جو بھی اس کی پاسبانی کرے گا وہ پو پھٹتے سو جائے گا۔ اگر کسی صورت میں جاگتا رہ جائے تو دیو پر فتح پائے گا۔ سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھتا کیا ہے، ایک لحیم شحیم دیو باغ کی فصیل لانگ کر داخل ہوتا ہے اور پھولوں کی کیاریوں کو روندتا ہوا پھل دار درختوں پر چڑھ جاتا ہے۔ بس شہزادے نے دیکھا اور پلک جھپکتے ہی اس کی دم سے لٹک گیا۔ دیو ڈال ڈال تو شہزادہ پات پات۔ دیو نے کہا، میں سیر ہوں، شہزادہ بولا، میں سوا سیر۔ دیو پلٹا، شہزادہ کود کر اس کی پیٹھ پر.....''

''سو گیا کیا؟''

''نہیں دادی جان۔''

''اچھا تو سن۔'' اور پھر وہ بہت دیر تک دیو اور شہزادے کے داؤ پیچ بیان کرتی رہیں۔ ''آخر کار دیو کی ہار ہونی تھی، سو ہوئی۔ بولا تو جیتا میں ہارا۔ اب مجھے چھوڑ، اس کے عوض تجھے سات بال دوں گا جو وقتِ ضرورت تیرے کام آئیں گے۔ جب مصیبت پڑے تو ایک بال جلا دینا، باقی برے وقت کے لیے رکھ لینا۔''

یہ کہہ کر دادی جان نے اطمینان کی سانس لی، اس کے بعد سانسوں میں آواز پیدا ہونے لگی اور وہ سو گئیں۔ نو روز رات کو کہانی کی اگلی کڑی سنتا اور دن میں باغ اور کوٹھی کے چکر لگاتا۔ یہ سلسلہ کئی روز تک چلتا رہا، پھر ایک دن نو روز نے دادی جان سے کہا۔

''آج کہانی پوری کر کے ہی سوئیے گا دادی جان۔''

''اچھا تو کہاں تک پہنچے تھے؟'' لمحے بھر سوچ کر خود ہی قصے کو مختصراً دہرانے لگیں۔

''شہزادے نے بادشاہت نہیں لی اور اپنے بھائیوں کی تلاش میں راج پاٹ چھوڑ کر چل پڑا۔ بھائی ملے مگر مارے حسد کے اسے سائیس بنا کر رکھا۔ بھائی سویرے نکلتے، شام کو لوٹتے اور بہت فکر مند رہتے۔ ایک شب بھائی سمجھے وہ سو گیا ہے مگر وہ جاگ رہا تھا، بھائیوں کو کہتے سنا کہ آج پھر منادی ہوئی ہے کہ جو شخص برج کی محراب میں بیٹھی شہزادی گلشن آرا کو محل کے پہلے دروازے سے پھول کی گیند مارنے میں کامیاب ہو جائے گا وہ اسی کے ساتھ شادی کرے گی۔ اشتیاق بڑھا، چھپ کر بھائیوں کے پیچھے چل دیا اور یہ ماجرا دیکھا کہ دور دراز ملکوں سے آئے شہزادے اپنی اپنی قسمت آزما رہے ہیں مگر شہزادی جس بارہ دری میں بیٹھی ہے وہاں ہوا کچھ اس رخ سے چلتی ہے کہ شہزادی تک گیند کا پہنچنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسے طلسمی بالوں کا خیال آیا۔ ایک بال جلایا، سبز گھوڑا سبز جوڑا تیار اور پھولوں کی ایک گیند جو شہزادے کے اشارے کے تابع دار تھی، ہاتھ میں آ گئی۔ کامیابی ملی، مگر وہ گھوڑے کو لے کر نظروں سے اوجھل۔ دوسرے دن سرخ جوڑا، سرخ گھوڑا اور گیند۔ گل ہزارہ کی گیند شہزادی گلشن آرا کے رخ روشن کو چھوتی اور بکھر جاتی۔ یہ سب اس طرح ہوتا جیسے بجلی کوند گئی ہو اور دیکھتے ہی دیکھتے شہزادہ نظروں سے غائب۔ ساتویں روز

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

سفید جوڑا پہنے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر جب وہ گیند مار کر فرار ہوا تو شہزادی کے منصوبے کے مطابق اس کے داہنے پیر کو محل کے سپاہیوں نے زخمی کر دیا۔ بس شہر بھر میں زخمی پیر والے شخص کی تلاش شروع ہوئی اور ایک سرائے کے پچھواڑے سائیس کے بھیس میں شہزادہ گرفتار ہوا۔ شہزادی کی ضد کے نتیجے میں شادی تو ہو گئی مگر بادشاہ سلامت کو کم رتبہ رشتہ پسند نہیں آیا۔ دونوں کو دو دھڑی اناج اور ایک اشرفی دے کر سلطنت سے نکال دیا۔ ان دونوں نے ایک دنیا بسائی۔ دنیا بسانے کا وہی پرانا طریقہ۔ ایک اشرفی کے کچھ چاول، کچھ ریشم کے دھاگے، کچھ زری کے تار اور کچھ اوزار، چاول کے دانے میدان میں ڈالے۔ رنگ برنگی چڑیا آئیں، پر ٹوٹے، ان کو سمیٹ کر پنکھا بنایا۔ شہزادہ بازار میں بیچ آیا۔ پھر چاول کے دانوں، ریشم کے دھاگوں اور زری کے تاروں کی تعداد بڑھتی گئی۔ ہر روز کئی کئی پنکھے تیار ہونے لگے۔ پھر فرشی پنکھے، چھت سے لٹکنے والے پنکھے اور دیوار کے قالین بننے لگے۔ کاروبار بڑھا تو ایک گڑھی نما قلعہ بنوایا، یوں ان کی دنیا آباد ہو گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کی اور پھر ایک باغ لگایا۔"

"بس دادی جان۔ آگے کا قصہ مجھے معلوم ہے۔"

"تجھے کیسے معلوم؟"

"ہمارے ہی شہر کی تو کہانی ہے۔ باغ کوٹھی کے دربان شیر قام نے مجھے سنائی تھی۔ اور دادی جان وہ کہانی میں نے رات میں نہیں دن میں سنی تھی۔"

دادی جان کو اطمینان ہو گیا، وہ سو گئیں لیکن نوروز جاگتا رہا اور آج وہ برسوں بعد سوچتا ہے کہ اس نے دادی جان سے جھوٹ کیوں بولا تھا۔ کیا وہ آگے کی کہانی سننا نہیں چاہتا تھا؟ مگر کیوں؟ شاید اس لیے کہ گلشن آرا کے لگائے ہوئے باغ کی کہانی وہ سننا نہیں، دیکھنا چاہتا تھا۔ اور باغ لگتے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اب اجڑے ہوئے بھی دیکھ رہا ہے۔ یہ باغ ہزاروں سال میں لگ پایا تھا، نوروز کی آنکھیں اس کی گواہ ہیں۔ ہزاروں سال پرانی آنکھیں۔ ایک ایک پودا اس کے سامنے لگا ہے اور ایک ایک پھول اس کی آنکھوں کے آگے کھلا ہے۔ یہ باغ نہیں مختلف پھولوں سے بنی شہزادہ گل ریز کی گیند ہے جو گلشن آرا کے رخِ روشن سے ٹکرا کر بکھر گئی ہے۔

نوروز کا دنیا دیکھنے اور زندگی کو سمجھنے کا یہ طلسمی انداز واقعات کو یوں دیکھتا ہے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ شہر میں نٹوں کی ایک ٹولی داخل ہوئی۔ ایک نوجوان نٹ اور اس کی نہایت ملوک نٹنی نے اعلان کیا کہ وہ نقلی پر لگا کر دو کوس تک اڑ سکتے ہیں۔ بس لوگ جمع ہونے لگے۔ اس کی خبر گڑھی کی بالائی منزل پر شہزادی گلشن آرا کے کانوں تک پہنچی۔ شہزادی نے نٹ کے اس جوڑے کو بلوا بھیجا۔ کرتب شروع ہوا۔ مشرقی برج سے چھاج کے نقلی پر لگا کر دونوں اڑے۔ دو کوس کا دعویٰ تھا، ڈھائی کوس تک اڑتے رہے اور پھر جب گرے تو خدا کا کرنا، دونوں نے وہیں دم توڑ دیا۔ شہزادی گلشن آرا پالکی میں سوار ہو کر جب وہاں پہنچیں تو دیکھتی کیا ہیں کہ وہاں نہ کوئی نٹ ہے اور نہ کوئی نٹنی۔ لاش کا کہیں پتہ نہ تھا، بس دو پھول کھلے ہوئے تھے۔ رنگ ان کا ایسا کہ دنیا میں مثال نہیں۔ شہزادی گلشن آرا نے حکم نامہ جاری کیا کہ یہاں ایک ایسا باغ لگایا جائے جس میں دنیا بھر کے نایاب و نادر پھول، طرح طرح کے پھل اور بے شمار خوبصورت درخت ہوں۔ باغ کی چہار دیواری ایسی ہو کہ جس میں ہزار دروازے ہوں اور سارے

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

دروازے سبھی کے لیے کھلے رہیں۔ باغ کی پہرے داری گل صد برگ کریں اور ان کی سواری گل گوں ہو۔ شہزادی کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ پہلے تمر ہندی، برگد، پیپل اور املتاس کے درخت لگائے گئے اور پھر درمیانی روشیں مولسری، آبنوس اور صنوبر کے درختوں سے آراستہ کی گئیں۔ باغ کے وسط میں ایک عالی شان عمارت تعمیر کی گئی جو باغ کوٹھی کے نام سے مشہور ہوئی۔ لوگ مختلف ممالک سے آتے، اپنے ساتھ نایاب قسم کے پودے لاتے اور باغ کوٹھی میں قیام کر کے محسوس کرتے گویا باغ میں نہیں شہزادی گلشن آرا کے دل میں قیام پذیر ہوں۔ کچھ آنے والے کوہِ قاف کو عبور کر کے آئے تو کچھ سمندر کے راستے۔ دور دور تک اس گل کدے کی شہرت تھی۔ لوگوں کی آمد کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ اب گل داؤدی، گلِ رعنا اور گلِ آفتاب کے ساتھ ساتھ کرسمس ٹری، پام کے درخت اور منی پلانٹ کی بیلیں بھی اس چمن زار میں دکھائی دینے لگی تھیں۔

پھر کیا ہوا، کیسے ہوا کہ باغ اجڑنے لگا۔ نوروز بستر پر لیٹا سوچ ہی رہا تھا کہ گلیارے میں ایک شور اٹھا۔ بیٹھک کی کھڑکی کھول کر دیکھا کہ باغ کی پاسبانی کا عزم لیے کچھ لوگ نعرے لگاتے گلی سے گزر رہے ہیں۔ وہ بھی چبوترے پر نکل آیا اور ہجوم کے سنگ سنگ چلنے لگا۔ پھر اس نے جانا کہ بھیڑ باغ میں داخل ہو چکی ہے اور وہ تنہا دروازے کے باہر کھڑا رہ گیا ہے۔ نظریں اٹھائیں تو پایا کہ اب فصیل مزید اونچی کر دی گئی تھی اور اس کے تمام دروازے پتھروں سے چن دیے گئے تھے۔ صرف صدر دروازہ کھلا تھا، جس پر سیاہ وردی پہنے سپاہی آبنوس کے درختوں کی طرح جامد و ساکت کھڑے تھے۔ اندر جانے کی کوشش کی، پر اسے یہ کہہ کر روک دیا گیا کہ ابھی اجازت نہیں۔ کارروائی شروع ہو چکی ہے۔

دوسرے روز سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ باغ کی طرف روانہ ہو گیا۔ صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ جہاں مولسری اور صنوبر کے شجر تھے وہاں ببول کی کانٹے دار جھاڑیاں اُگ آئی ہیں۔ حوض جس میں ہر پل فوارہ چلتا رہتا تھا اسے بارش کے پانی اور کائی کی پرتوں نے مینڈکوں کا مسکن بنا دیا ہے۔ سامنے نگاہ کی تو کھلا کہ باغ کی کوٹھی کے کھنڈر دم سادھے کھڑے ہیں۔ کوٹھی کی بلند محراب کی طرف گردن اٹھائی تو اندھیرے میں ڈوبے آسمان کا عکس نظر آیا۔ محراب ٹوٹ کر گر چکی تھی اور ستون سرنگوں تھے۔ وہ بڑھتا رہا اور آگے بڑھتا رہا کہ ایک پتھر سے ٹکرا کر اوندھے منہ آ گرا۔ کانپتی انگلیوں سے ٹٹولا تو دو قبروں کے نشان پائے۔ اسے معلوم ہے یہ قبریں شہزادہ گل ریز اور شہزادی گلشن آرا کی ہیں۔ اب سورج آسمان پر پاؤں جما چکا تھا۔ صدر دروازے کے باہر ہجوم جمع ہونے لگا۔ نوروز اٹھا اور باغ کوٹھی کے کھنڈر کی ایک دیوار کے پیچھے چلا گیا اور سوچنے لگا۔ نگہ داشت کی تمام کوششیں جاری ہیں، پھر آخر یہ باغ روز بہ روز کیوں ویران ہوتا جا رہا ہے؟ باہر ایک ازدحام ہے اور گشت پہلے سے زیادہ سخت۔ ''کیا ہزاروں سال پرانا دیو پھر سے.....''

ایک شور اٹھا اور بھیڑ اندر داخل ہو گئی۔ کچھ لوگ حوض کے چبوترے پر، باقی حوض کے چاروں طرف بیٹھ گئے۔ چبوترے پر ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔ ''باغ کی حفاظت کی ذمے داری اب ہماری ہے۔ صدر دروازے کو بھی باقی دروازوں کی طرح بند کر دینا ہوگا۔''

مجمعے سے ایک آواز اُبھری۔ ''باہر سے کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوگی۔'' یہ کہہ کر اس نے دامن سمیٹ لیا اور بیٹھ گیا۔

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

چبوترے پر کھڑا شخص پھر بولا۔ ''یوں تو ہم نے صدیوں سے اس باغ میں کسی گل ریز اور کسی گلشن آرا کو نئی قسم کا کوئی بھی پودا لگانے نہیں دیا ہے کیوں کہ ہر نیا پودا پرانے پودے کو غارت کر دیتا ہے۔ چہار دیواری کے باہر سے لائے ہوئے پودے لگا کر باغ کی فضا کو آلودہ کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔''

نوروز دیوار کی آڑ میں کھڑا حیرت سے سن رہا تھا۔ ''نئے پودوں کی آمد پر بندش؟ کہیں باغ کے ویران ہونے کی یہی وجہ تو نہیں۔ ہاں یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے باغ اجڑا ہی نہ ہو بلکہ نئے پھولوں کے نہ کھلنے اور نئے پھلوں کے نہ پھلنے کے سبب دنیا کے دوسرے باغوں کے مقابلے میں اجڑتا ہوا سا محسوس ہو رہا ہو۔''

اب اس نے دیکھا کہ چبوترے پر کوئی دوسرا شخص آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اس شخص نے شلوکے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور مسکراتے ہوئے باغ کے چوتھے کھونٹ کی طرف اشارہ کیا، جیسے اس نے رکھوالی کا کوئی کارگر طریقہ ڈھونڈ نکالا ہو۔ دیوار کے پیچھے سے نوروز نے جھانک کر دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ وہاں سے گلِ رعنا، گلِ جعفری اور گلِ سوسن کے پودے اکھاڑ دیے گئے تھے۔ ہاں کیتکی اور ناگ پھنی کے پودے قطاروں میں اسی طرح لگے ہوئے تھے۔

''باغ کی صفائی کے نام پر خودرو گھاس سمجھ کر ان لوگوں نے سب پودے اکھاڑ پھینکے۔ گلِ سوسن بھی!'' اس نے چیخ کر کچھ کہنا چاہا مگر اب اس کی زبان پوری طرح گنگ ہو چکی تھی۔ کیوڑے کی جھاڑیوں سے ایک سانپ نکلا اور گلِ شب افروز کے جھنڈ سے ہوتا ہوا بھیڑ میں شامل ہو گیا۔ کچھ لوگ بلم بھالے لے کر دوڑے اور سانپ مارنے کے بجائے گلِ شب افروز کے پودوں کو جڑ سے اکھاڑنے لگے۔ اب حوض پر کھڑا وہ شخص کہہ رہا تھا کہ..... ''بے کار اور بے میل پیڑ پودے اکھاڑ پھینکو۔ برگد کی صف میں برگد اور پیپل کی صف میں پیپل۔ پلکھن، چیڑ، ساکھو اور بس.....'' اس کی بات ادھوری ہی تھی کہ بغیر کچھ سوچے، بغیر کچھ سمجھے بھیڑ چاروں طرف بکھر گئی اور پلک جھپکتے خیارشنبر، پام اور ایروکیریا کے درخت اکھاڑ پھینکے۔

''اے خدا یہ باغ کی زیبائش کا کون سا طریقہ ہے؟ اے میرے پاک پروردگار کیا اب اسے بچانے کی کوئی تدبیر نہیں۔ اے قادرِ مطلق کوئی ترکیب بتا۔ ہاتھ میں چاقو اور سرخ مرچوں کی شیشی لے کر کسی شہزادے کو بھیج۔'' اتنے میں دیکھتا کیا ہے کہ کچھ نوجوان ایک ہاتھ میں چاقو اور دوسرے ہاتھ میں شیشی لیے باغ میں داخل ہوئے۔ وہ سب پہرے کے لیے باغ کے کونے کونے میں منتشر ہونا ہی چاہتے تھے کہ ایک بوڑھا شخص سامنے آ کھڑا ہو گیا۔

''دیکھو میرے چہرے پر یہ جھریاں دیکھو۔'' پھر اس نے کئی انگلی کا زخم دکھایا اور رقّت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں یہ ترکیب صدیوں سے آزماتا آ رہا ہوں۔ کوئی فائدہ نہیں۔ یہ تدبیر اب کارگر نہیں رہی۔ اب کوئی دیو باغ کی دیوار پھلانگ کر اسے اجاڑنے کے لیے باہر سے نہیں آتا، اس کے اجڑنے کا سبب کچھ اور ہے، تو ظاہر ہے نگہبانی کی تدبیر بھی کچھ اور ہی ہوگی۔'' اتنا سننا تھا کہ مجمع پر سکتہ سا طاری ہو گیا اور پھر ایک ایک کر کے سب واپس ہو لیے۔ وہ بھی جو بعد میں آئے تھے اور وہ بھی جو حوض کے گرد جمع تھے۔

ایک روز پھر شہر میں ڈُگی پٹی، اعلان ہوا کہ ''باغ کی حفاظت کے تمام حربے آزمائے جا چکے ہیں، مگر ہر بار ناکامی

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

ہاتھ آتی ہے۔ باغ متواتر ویران ہوتا جا رہا ہے۔ ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ سورج طلوع ہونے سے قبل باغ کے صدر دروازے پر پہنچے۔'' سورج طلوع ہونے میں ابھی دیر تھی۔ صدر دروازہ بند تھا۔ بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ نوروز بھی ہزاروں سال پرانی آنکھوں میں ویرانی لیے وہاں موجود تھا۔ دروازے پر بڑی سینی میں چاندی کے ورق پر لپٹا ایک بیڑا رکھا تھا۔ ایک جم غفیر تھا مگر خاموش..... ''تو کیا اسی طرح لوگ شام ہوتے ہوتے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے؟'' آخر کار شام بھی ہوگئی۔ دن بھر کی گرم ہوا نے سینی میں رکھے بیڑے کو جھلسا دیا۔ لگتا تھا کہ ایک جھٹکے کے ساتھ لوگ پلٹیں گے اور واپس شہر کی طرف دوڑ پڑیں گے کہ اچانک مجمع سے ایک آواز آئی جیسے بجلی چمکی ہو اور پھر بادل گرجنے لگے۔ مجمع کو چیرتا ایک بوڑھا، اپنی جھولی کو بغل میں دبائے صدر دروازے کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ نوروز نے پہچاننے کی کوشش کی۔ ''کیا یہ گل ریز ہے؟ نہیں۔ تو پھر شاید نوروز نہیں۔ میں تو یہاں کھڑا ہوں اگر اس وقت میرے چہرے کے سامنے آئینہ ہوتا تو ضرور اس بوڑھے کو قریب سے دیکھ پاتا۔'' اس نے تھوڑا آگے بڑھ کر پہچاننے کی کوشش کی۔ ''ارے یہ تو وہی بوڑھا ہے جس نے کئی انگلی کا زخم دکھا کر مجمع کو واپس کیا تھا۔ اس دن یہ کتنا مایوس تھا مگر آج اس کے چہرے پر یہ چمک؟ شاید میری آنکھوں کی چمک ہو۔'' پھر کیا تھا، بوڑھے نے بیڑا اٹھایا اور آسمان کی طرف دیکھ کر منہ میں رکھ لیا۔ لوگ مضطرب تھے۔ شاید دیکھنا چاہتے تھے کہ اس کی جھولی میں کیا ہے؟ بوڑھے کی تجربے کار آنکھیں مسکرائیں۔ اس نے جھولی میں ہاتھ ڈالا، سب سے پہلے جو چیز نکلی وہ گل ہزارہ کی ایک خوبصورت گیند تھی۔ پھول کی اس گیند کے چاروں طرف نیلوفر، نسترن اور یاسمین کی پتیاں گندھی ہوئی تھیں۔ اس جھولی سے پھر ایک تیشہ نکلا نوروز نے دیکھا کہ تیشے کی نوک پر فصیل کے تمام بند دروازوں کو توڑنے کا عزم چمک رہا تھا۔

''سب سے پہلے باغ کے تمام دروازے کھولنے ہوں گے۔'' بوڑھے نے کہا۔ نوروز کچھ اور آگے بڑھ گیا۔ باغبانی کے اوزار اور کچھ نایاب و نادر پھولوں کے پودے دیکھ کر وہ بوڑھے کے بالکل قریب جا پہنچا، اتنا قریب کہ شاید دونوں میں اب کوئی فرق نہ رہا تھا۔

لوگ حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ ایک آواز آئی۔

''رکھوالی کا یہ کون سا طریقہ ہے؟''

بوڑھے نے اس طرف دھیان نہیں دیا اور نرمی سے کہا۔ ''آپ سے دست بستہ گزارش ہے کہ سب اپنی اپنی مٹھیاں کھول دیں۔''

سب نے بند مٹھیاں کھول دیں، پھر صدر دروازہ کھلا، بوڑھا باغ میں داخل ہوا ہی چاہتا تھا کہ ٹھٹھکا، پلٹ کر نوروز کی طرف آیا اور بولا۔ ''ممکن ہے میں باغ کی نگہبانی میں کامیاب ہو جاؤں۔ ممکن ہے باغ پھر سے سرسبز ہو جائے۔ ممکن ہے اس گلستاں کا دامن بہت وسیع ہو جائے مگر اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ باغ پھر نہیں اجڑے گا۔'' نوروز یہ سوال سن کر بوڑھے کے قدموں میں گر گیا۔ بوڑھے نے جھک کر اسے اٹھایا اور جھولی میں ہاتھ ڈال دیا۔ سب تعجب سے دیکھ رہے تھے کہ اب جھولی سے کیا نکلتا ہے۔ اس نے جھولی سے سیاہ دستے اور تیز دھار والی کوئی شے نکال کر نوروز کے ہاتھ میں تھما دی۔

''شاید چاقو ہے! لیکن مرچوں کی شیشی؟'' نوروز سوچ ہی رہا تھا کہ بوڑھے نے پھر جھولی میں ہاتھ ڈال دیا اور ایک

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

شیشی نکال کر نوروز کو دی اور کہا۔ ''اگر تو اس کا صحیح استعمال کرے گا تو یہ باغ قیامت تک شاداب و سرسبز رہے گا، لیکن....'' اس نے 'لیکن' سے آگے کچھ کہنا چاہا مگر پھر 'لیکن' کے سوا کچھ نہ کہہ سکا اور مجمع کی طرف دیکھ کر مایوس ہو گیا۔

نوروز نے دونوں چیزوں کو دیکھا۔ ان میں نہ کوئی چاقو تھا اور نہ مرچوں کی شیشی۔ اس نے پھر غور سے دیکھا اور سیاہ روشن رقیق سے لبریز شیشی کے ڈھکن کو کھولا اور تیز دھار والی چیز کے ایک سرے کو داہنے ہاتھ سے انگوٹھے اور دو انگلیوں کے پوروں کے درمیان دبا کر شیشی میں ڈبو دیا۔ ایسا کرتے ہی اس کے چہرے سے دانش وری کی شعاعیں پھوٹنے لگیں اور باغ کی فصیل پر ایک تحریر ابھر آئی۔ نوروز کے ذہن کے تار جھنجھنانے لگے۔ آسمان کی جانب نظریں اٹھائیں تو دیکھا کہ ایک پریوں کی شہزادی، ماتھے پر نقرئی تاج، ہاتھ میں قدیم ساز، بنس پر سوار، باغ کے دروازے کے بہت قریب سے گزر رہی ہے۔

یہ ماجرا نوروز اور بوڑھے کے سوا سب کی نگاہوں سے پوشیدہ رہا اور پھر یوں ہوا کہ جس نے بوڑھے کو دیکھا وہ نوروز کو نہیں دیکھ سکا اور جو نوروز کو دیکھ رہا تھا اس کی نظروں سے بوڑھا غائب تھا۔

لفظ و معنی

تسبیح	–	سو دانوں کی مالا، خدا کو پاکی سے یاد کرنا
ہُنکارے بھرنا	–	ہاں ہاں کہنا
لختِ جگر	–	جگر کا ٹکڑا، اولاد
جانِ پدر	–	باپ کی جان، پیاری اولاد
کنی انگلی	–	ہاتھ یا پانو کی سب سے چھوٹی انگلی، چھنگلی
شہر بدر کرنا	–	کسی جرم یا گناہ کے سبب شہر سے باہر کرنا، دیس سے نکال دینا
خوش بخت	–	خوش قسمت
بیڑا اٹھانا	–	آمادہ ہونا
نمودار ہونا	–	ظاہر ہونا
قلندر	–	فقیر
پَو پھٹنا	–	صبح کی سفیدی کا نمایاں ہونا
لحیم شحیم	–	موٹا تازہ
فصیل	–	چار دیواری، شہر کی چار دیواری
حسد	–	جلن، کینہ
سائیس	–	گھوڑے کی دیکھ بھال کرنے والا
بُرج	–	گنبد

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

محراب	-	گول دروازہ، طاق، شاہی خلوت گاہ
اشتیاق	-	شوق
تابع دار	-	حکم ماننے والا
رخِ روشن	-	روشن چہرہ
کوندنا	-	بجلی چمکنا
نایاب	-	جو پایا نہ جائے، نادر، قیمتی
دھڑی	-	پانچ سیر کا وزن
رَوِش	-	طریقہ، انداز
آراستہ	-	سجا ہوا
وسط	-	درمیان، بیچ
قیام پذیر	-	ٹھہرا ہوا
عبور	-	پار کرنا
گل کدہ	-	پھول کا گھر، گلشن، پھلواری
زری	-	سونے کا تار
مَلُوک	-	خوبصورت
جامد وساکت	-	بے حس وحرکت
چُن دینا	-	دیوار اٹھانا، عمارت تعمیر کرنا
مسکن	-	سکونت کی جگہ، رہنے کی جگہ
ستون	-	کھمبا
عکس	-	سایہ، پرچھائیں، جھلک
سرنگوں	-	سر جھکانا
ازدحام	-	بھیڑ، مجمع
گشت	-	گھومنا، ٹہلنا
پانو جمانا	-	ثابت قدمی سے رہنا، مضبوطی کے ساتھ ڈٹنا
غارت	-	برباد
بندش	-	بندھن، گانٹھ، گرہ
شلوکہ	-	ایک قسم کا کُرتا

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

ششدر	-	حیران، بھونچکا
خودرَو	-	جو بغیر بوئے آپ اُگ آئے
خِیارِ شَنبر	-	املتاس
زیبائش	-	سجاوٹ، خوبصورتی
سکتہ	-	ایک بیماری جس میں انسان مُردے کی طرح بے حس و حرکت ہو جاتا ہے
جَمِ غفیر	-	بہت بڑی بھیڑ
شعاعیں	-	کرنیں
نقرئی	-	چاندی کا، چاندی جیسا
گلِ ہزارہ	-	بہت سی پنکھڑیوں والا پھول، گیندا
گلِ صد برگ	-	گیندا، گیندے کا پھول
گلِ داؤدی	-	ایک قسم کا پھول، یہ زرد سفید ہوتا ہے
گلِ رعنا	-	ایک قسم کا عمدہ پھول جو اندر سے سُرخ اور باہر سے زرد ہوتا ہے۔ دورنگا پھول
گلِ آفتاب	-	سورج مکھی
گلِ جعفری	-	ایک قسم کا زرد پھول جو گیندے کے مشابہ ہوتا ہے۔
گلِ سوسن	-	ایک طرح کے آسمانی رنگ کا پھول
گلِ شب افروز	-	رات کو روشن کرنے والا، چاند، جگنو
تمرِ ہندی	-	املی کا درخت
نیلوفر	-	کنول
روِش	-	باغ کی پٹری، طور، طریقہ
نسترن	-	ایک قسم کا خوشبودار سفید گلاب
مولسری	-	ایک درخت جس کے پھول خوشبودار ہوتے ہیں
یاسمین	-	چنبیلی
آبنوس	-	ایک قسم کا درخت جس کی لکڑی بہت مضبوط اور سیاہ ہوتی ہے
صنوبر	-	چلغوزے کا درخت
کوہِ قاف	-	ایک پہاڑ جو اشیائے کوچک کے شمال میں واقع ہے
کیکی	-	ایک مشہور خوشبودار پودے کا نام جو کیوڑے کے درخت کی طرح ہوتا ہے

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

آپ نے پڑھا

- بادشاہ، شہزادہ، شہزادی، دیو، فقیر، نٹ اور نٹنی —— روایتی قصہ گوئی کے سارے لوازم طارق چھتاری نے اس افسانے میں شامل کر دیے ہیں۔ بچے کی کہانی سننے سے جو سلسلہ شروع ہوتا ہے، وہ افسانے کے آخر تک قائم رہتا ہے۔ بیچ بیچ میں کچھ ذیلی قصے آتے ہیں اور قصے میں دل چسپی بڑھانے کے ساتھ ساتھ معنویت میں اضافہ کرتے ہوئے اصل قصے میں شامل ہو جاتے ہیں۔
- ''باغ کا دروازہ'' علامتی انداز کی کہانی ہے۔ باغ کو اگر آبادی یا ملک کے طور پر سمجھا جائے تو اس کہانی کی معنوی دنیا بے حد وسیع ہو جاتی ہے۔ کسی باغ، ملک یا قوم کی تعمیر و تشکیل کے مشکل اور صبر آزما کام کی بھی اس کہانی میں تفصیل موجود ہے اور عاقبت نا اندیش لوگوں کی کوتاہی سے ہرا بھرا چمن کیسے بدنما اور ویران ہو جاتا ہے، اس کے بارے میں بھی اس کہانی میں واضح اشارے موجود ہیں۔
- اس کہانی کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں معنی کی سطح سادہ اور پیچیدہ دونوں ہے۔ آپ اگر چاہیں تو اسے آسانی سے ایک پرانے زمانے کے باغ کی کہانی سمجھ سکتے ہیں اور اسی طور پر اس سے لطف حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن غور کرنے پر جب معنی کی دوسری پرتیں ابھرتی ہیں تو اس تخلیق کی دنیا بدل جاتی ہے۔ جس طرح اچھے شعر کے کئی مفاہیم ہوتے ہیں اسی طرح اچھی کہانی بھی بار بار پڑھتے ہوئے ہمیں نئے مطالب سے آشنا کراتی ہے۔

کچھ اور باتیں

- اس کہانی میں کئی کردار ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مختلف قصے بھی ہیں۔ لیکن باغ کی تعمیر اور باغ کے اجڑنے کی داستان وہ محور ہے جہاں ہمارا ذہن ہر وقت اٹکا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کہانی میں ارتکاز یا وحدت تاثر قائم ہوا ہے۔ افسانے کی یہ لازمی شرط ہے کہ اس میں وحدت تاثر ہو اور تمام واقعات ایک مرکز کے اردگرد ہی بُنے جائیں۔
- کیا آپ نے طارق چھتاری کی زبان پر غور کیا؟ موقع محل کے اعتبار سے وہ بدل کر نئی رنگت میں ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اس مختصر سی کہانی میں ان کے یہاں زبان اور اسلوب کے متعدد تجربے ہیں۔ اس افسانے میں بے شمار پھولوں کا تذکرہ ہے لیکن تمام درخت اور پھول تین سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں اور تین قوموں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ تمر ہندی، برگد، پیپل، املتاس، ناگ پھنی وغیرہ ہندی الاصل یعنی ہندستان کی علامت ہے۔ گلِ صنوبر، گلِ نیلوفر، گلِ شب افروز، گلِ رعنا وغیرہ عرب ایرانی تہذیب کو پیش کر رہے ہیں۔ کرسمس ٹری، پام ٹری، منی پلانٹ اور ایروکیریا یورپ اور انگلستان کی فضا قائم کرتے ہیں۔ اس طرح اس باغ یعنی ہندستان میں باہر سے آئی تین قومیں ہندو، مسلمان اور عیسائی پھولوں کی شکل میں موجود ہیں۔
- انھوں نے اس افسانے میں ''شعور کی رو'' تکنیک سے بھی کام لیا ہے۔ اردو میں قرۃ العین حیدر نے اپنے

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

ناول ''آگ کا دریا'' میں اور اس سے پہلے سجاد ظہیر نے ''لندن کی ایک رات'' میں اس تکنیک کو استعمال کیا تھا۔ ''شعور کی رو'' تکنیک کے استعمال کے دوران وقت کے تسلسل کو حسب ضرورت بدلنے کی اجازت ہوتی ہے۔ افسانے اور ناولوں میں ایسی تکنیک سے موضوعاتی اور زمانی وسعت پیدا ہوتی ہے۔ جس سے تاثر میں اضافہ ہوتا ہے۔

- قدیم داستانوں کی زبان سے بھی طارق چھتاری واقف ہیں۔ اس لیے جب دیو اور بھوت یا شہزادی اور شہزادے کے واقعات لکھتے ہیں، اس وقت لگتا ہے کہ ہم 100 سو یا 200 دوسو برس پہلے کی زبان کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ داستانی نثر کی تجدید ان کی فنی مہارت کا ثبوت ہے۔

آپ بتائیے

1- طارق چھتاری کے افسانوی مجموعے کا نام کیا ہے؟
2- شہزادی گلشن آرا کو شادی کے موقعے سے اس کے باپ نے کیا دیا؟
3- شہزادہ گلریز کو دیو پر جیت حاصل ہونے کے بعد انعام کے طور پر دیو سے کیا ملا؟
4- شہزادی گلشن آرا کے حکم سے جس باغ کی تعمیر ہوئی، اس میں کتنے دروازے رکھے گئے؟
5- ''گلوب'' افسانہ کس نے لکھا؟
6- نٹ اور نٹنی کتنی دوری تک اُڑ پائے؟
7- باغ کس مقام پر تیار کرایا گیا؟
8- اس افسانے سے پندرہ پھولوں کے نام چن کر اپنی کاپی میں درج کیجیے؟
9- اس افسانے کے پانچ کرداروں کے نام لکھیے؟

مندرجہ ذیل سوالوں کے مناسب جواب منتخب کیجیے:

1- ذیل میں سے کون سی تصنیف طارق چھتاری کی ہے؟
(الف) باغ بہشت (ب) باغ وبہار (ج) باغ کا دروازہ (د) باغ نور

2- ''باغ کا دروازہ'' کا کس ادبی صنف سے تعلق ہے؟
(الف) داستان (ب) افسانہ (ج) قصیدہ (د) ناول

3- بادشاہ سلامت کے کتنے بیٹے تھے؟
(الف) چار (ب) پانچ (ج) تین (د) چھے

4- کتنے شہزادے شہر بدر کیے گئے تھے؟
(الف) تین (ب) چھ (ج) پانچ (د) چار

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

5- چھوٹے شہزادے کا کیا نام تھا؟

(الف) گل آفتاب (ب) گل رعنا (ج) گل ریز (د) گل صنوبر

6- نعلی پر لگا کر کون اُڑے؟

(الف) شہزادہ اور شہزادی (ب) نٹ اور نٹنی (ج) فقیر اور فقیرنی (د) بادشاہ اور ملکہ

7- اس کہانی میں پنکھے کس چیز سے تیار کیے جاتے تھے؟

(الف) دھاگا (ب) گھاس پات (ج) پرندوں کے پر (د) کپڑے

8- شہزادی گلشن آرا نے کس چیز کے لیے حکم جاری کیا؟

(الف) کاشتکاری (ب) باغ (ج) پودا (د) دروازہ

□ (I) اور (II) کے صحیح جوڑے ملائیے

(I)	(II)
(الف) ایک عجیم شجیم دیو باغ کی	(۱) آدھی بادشاہت دینے کا وعدہ ہے۔
(ب) جس میں دنیا بھر کے نایاب و نادر پھول	(۲) سے چن دیے گئے تھے۔
(ج) دور دور تک	(۳) فصیل لانگ کر داخل ہوتا ہے۔
(د) اس کے تمام دروازے پتھروں	(۴) طرح طرح کے پھول اور پھل اور بے شمار خوبصورت درخت ہیں۔
(ر) پہرے کی کامیابی پر	(۵) اس گل کدے کی شہرت تھی۔

□ مندرجہ ذیل لفظوں کے مترادف بتائیے۔

گل - آفتاب - نایاب - گلشن - پدر - شب - سحر -

اس افسانے میں

□ ''گرمیوں کی تاروں بھری رات نے گھر کے بڑے آنگن کو شبنم کے چھڑکاو سے ٹھنڈا کر دیا تھا۔'' اس جملے سے ''باغ کا دروازہ'' افسانہ شروع ہوتا ہے۔ عام طور سے افسانے کی ابتدا کے جملے ماحول سازی کے لیے وقف ہوتے ہیں۔ طارق چھتاری نے اس افسانے میں ماحول سازی کے لیے صرف ایک جملہ استعمال کیا ہے۔ یہ جملہ منظر نگاری سے بھی متعلق ہے۔ آپ پانچ جملوں میں مذکورہ جملے کی تشریح کیجیے۔

□ ''نہیں جان پدر، شرط مشکل ہے اور تو عزیز۔ اگر تیرا پہرہ بھی ناکام ہوا تو اس وطن کے آخری ستارے کو بھی شہر بدر ہونا پڑے گا۔ شہر خالی ہو چکا ہے۔ تیرے پانچوں بھائی بھی میری آنکھوں کو ویران کر گئے ہیں۔''

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

اس اقتباس کی سیاق وسباق کے ساتھ تشریح کیجیے اور طارق چھتاری کی زبان کی خصوصیات بیان کیجیے۔

- ''اس کے چہرے سے دانش وری کی شعاعیں پھوٹنے لگیں اور باغ کی فصیل پر ایک تحریر ابھر آئی۔ نوروز کے ذہن کے تار جھنجھنانے لگے۔ آسمان کی جانب نظریں اٹھائیں تو دیکھا کہ ایک پریوں کی شہزادی، ماتھے پر 'نقرئی تاج' ہاتھ میں قدیم ساز، ہنس پر سوار، باغ کے دروازے کے بہت قریب سے گزر رہی ہے۔''

اس عبارت کو غور سے پڑھتے ہوئے 100 لفظوں میں اس کا مفہوم لکھیے۔

- اس افسانے میں مختلف اقسام کے پھل، پھول اور پیڑ پودوں کے حوالے سے تہذیبی اور ثقافتی پس منظر ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس بات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے افسانے کا مطالعہ کیجیے اور ایک ایک اقتباس منتخب کیجیے جس میں الگ الگ تہذیبی اور ثقافتی عناصر نمایاں ہو جائیں۔
- اس افسانے سے ایسے واقعات اور اشارے جمع کیجیے جن سے پتا چل سکے کہ یہ افسانہ ہمارے ملک ہندستان کی تاریخ اور تہذیب کی ہی کہانی ہے۔
- باغ کی تعمیر اور زوال کے واقعات افسانے سے چن کر جمع کیجیے اور تبصرہ کیجیے۔

تفصیلی گفتگو

1- شہزادہ گل ریز نے باغ کی نگہبانی کیسے کی؟

2- شہزادی گلشن آرا کی مشکل شرط کو کس نے حل کیا اور کس طرح؟

3- ''باغ کا دروازہ'' میں افسانہ نگار نے کن کن ملکوں کے پھولوں کا تذکرہ کیا ہے؟

4- شہزادی گلشن آرا نے کیا حکم جاری کیا اور اس کی تعمیل کیسے ہوئی؟

5- ''باغ کا دروازہ'' علامتی افسانہ کیسے ہے؟

6- ''باغ کا دروازہ'' میں کس باغ کے بسنے اور اجڑنے کا تذکرہ ہے؟

7- شہزادہ گل ریز نے شہزادی گلشن آرا کو کیسے حاصل کیا؟

آیئے، کچھ کریں

1- ایک باغ کی تصویر بنایئے اور اس کو شاداب رکھنے کی ترکیب دکھایئے۔

2- ہمارا ملک ایک باغ ہے۔ اس میں رہنے والے لوگ مختلف قسم کے پھول ہیں۔ ایک کہانی کے ذریعہ اس کے اتحاد کی نشان دہی کیجیے۔

3- ہندستان کا نقشہ بنایئے اور مختلف رنگوں سے یہ واضح کیجیے کہ یہاں مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے افراد ایک ساتھ رہتے ہیں۔

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

غزال ضیغم

غزال ضیغم اتر پردیش کے ضلع سلطان پور کے ایک گانو "باہر پور" میں 17 دسمبر 1968ء کو پیدا ہوئیں۔ الہ آباد یونی ورسٹی سے علم نباتات میں ایم۔ایس سی۔ کیا۔ قانون کی ڈگری اور اردو زبان وادب میں ایم۔اے۔ کے ساتھ ہی انھوں نے فلم اور ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ، پونا سے فلم اپری سی ایشن کورس مکمل کیا۔ ہندی رسالہ "منورما" (الہ آباد) کی سب ایڈیٹر اور آل انڈیا ریڈیو میں کیزوَل اناؤنسر رہیں۔ افسانے اور ڈرامے لکھنا، انھیں اسٹیج کرنا اور آبی رنگوں سے تصویریں بنانے کے ساتھ غزال ضیغم نے اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش، لکھنؤ میں فلم پروڈیوسر کے عہدے پر فائز ہیں۔ انھوں نے متعدد ڈاکیومنٹری فلمیں بھی بنائی ہیں۔

محترمہ غزال ضیغم نے اپنے گھر کے ادبی ماحول سے متاثر ہوکر لکھنا شروع کیا۔ ان کے افسانوں میں کرداروں کی نفسیات کے ساتھ ساتھ اخلاقی، معاشرتی اور معاشی زندگی کے اکثر وبیش تر گوشوں کی تصویر کشی ہوتی ہے۔ ان کے مشاہدے میں گہرائی اور بے باکی ہے۔ ان کے بعض افسانوں میں عورتوں کی نفسیات، بالخصوص بدلتی ہوئی دنیا میں خواتین کے نئے رول پر اُن کے خیالات توجہ طلب ہیں۔ "سوریہ ونشی۔ چندر ونشی"، "بھولے بسرے لوگ"، "نیک پروین"، "چراغ خانۂ درویش"، "گنبد تیز گرد نیلی فام" اور "مدھوبن میں رادھیکا" ان کے قابلِ ذکر افسانے ہیں۔ "ایک ٹکڑا دھوپ کا" (۲۰۰۲ء) ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ امرتا پریتم کی کتاب "ایک تھی سارا" کا انھوں نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اردو کے علاوہ ہندی، انگریزی اور مراٹھی میں بھی ان کی تخلیقات شائع ہوئی ہیں۔

مابعد جدید عہد میں اردو کے تانیثی منظرنامے پر جن افسانہ نگاروں کو سنجیدگی سے پڑھا جارہا ہے، ان میں غزال ضیغم کی خاص اہمیت ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں یادوں میں لپٹی ہوئی ایک نیم شاعرانہ زبان خلق کرنے کی کوشش کی ہے۔ واقعات کی تفصیل میں وہ الفاظ اور جملوں سے زیادہ اشارات سے کام لیتی ہیں۔ رنگوں کا اس قدر واضح شعور بہت کم افسانہ نگاروں کے حصّے میں آیا ہے۔ جاگیردارانہ تہذیب کے ڈھلتے سورج پر اکثر ان کے یہاں مشاہدات درج ہوتے ہیں۔ بعض عجیب الخلقت کرداروں کی تخلیق اور انھیں وضاحت کے ساتھ پیش کرنا غزال ضیغم کا مخصوص فنی طریقۂ کار ہے۔

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

غزال ضیغم

مختصر افسانہ

خوشبو

شاید تم کو یقین نہ آئے کہ مجھے دھوئیں میں خوشبو محسوس ہوتی ہے، ایک عجیب سی خوشبو۔ دھوئیں سے کبھی کبھی ایک تلخ سی کسیلی خوشبو آتی ہے اور کبھی کبھی بے حد نرم سی خوشبو..... روٹیوں کی مہک لیے ہوئے۔

ہمارے گھر میں کھانا لکڑی والے چولہے پر پکتا تھا۔ لکڑیاں جلا کر میری بڑی بہن چپاتیاں پکاتی تھی اور میں اکڑوں چولہے کے آگے بیٹھ کر دھوئیں کی خوشبو اور انگاروں سے باتیں کرتا تھا۔ اکثر بے خودی کے عالم میں ہاتھوں کو آگے پھیلا لیا کرتا تھا۔ میری بہن کی روٹی پھٹ جاتی تھی اور وہ جھنجھلا کر مجھے ڈانٹتی تھی۔ ''پیچھے ہٹ۔ بیوقوف۔ میری چپاتی خراب کردی۔''

اب میری بہن لندن میں ہے۔ وہاں بند ڈبوں کا کھانا خود کھاتی ہوگی، اپنے شوہر و بچوں کو کھلاتی ہوگی۔ میں ہوٹل پر ..... ڈبل روٹی پر جی رہا ہوں۔ لیکن جہاں کہیں بھی دھوئیں کی لکیر شام کو یا صبح کے دھندلکے میں اٹھتی دیکھتا ہوں، یہی محسوس کرتا ہوں کہ یہ خوشبودار دھواں روٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو لیے ہوئے ہے۔

مجھے پتیوں سے ہری ہری خوشبو آتی ہے، دھان کے کھیت سے دھانی دھانی خوشبو۔ مجھے خود حیرت ہے کہ مجھے خوشبو کا رنگ کیسے محسوس ہو جاتا ہے؟ ہلکی ہلکی شروع کی سردیوں میں مجھے گلابی گلابی خوشبو آتی ہے اور یہ موسم مجھے بے حد پسند ہے۔ جب میں اپنی بہن کے ہاتھوں کا بنا ہوا پل اوور پہن کر کشادہ سڑکوں پر یوکلپٹس کے سایہ دار درختوں کے بیچ سے گزرتا ہوں اور جاڑوں

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

کی گلابی گلابی خوشبو محسوس کرتا ہوں۔

میں صرف اپنی بہن کے ہاتھوں کے بنے ہوئے سوئیٹر پہنتا ہوں۔ نہ بازار کے نہ ہی کسی اور کے ہاتھ کے۔ کیونکہ اس کے ایک ایک پھندے میں میرے لیے ممتا کی خوشبو رچی بسی ہوتی ہے۔

میری امّاں مجھے جنم دیتے ہی گزر گئی۔ مجھے میری بہن نے اپنے بچّے کی طرح پالا پوسا۔ حالاں کہ وہ مجھ سے صرف آٹھ سال ہی بڑی ہے لیکن مجھ سے بزرگوں جیسا برتاؤ رکھتی ہے۔ وہ مجھے آج بھی بچّہ سمجھتی ہے۔ جب کہ میں اٹھائیس سال کا اچھا خاصہ میچور لڑکا ہوں۔ ایک فرم میں اکاؤنٹ سیکشن میں کام بھی کر رہا ہوں۔

جب اس کی شادی ہوئی تو میں چھوٹا ہی تھا اور اس کی شادی سے میں بہت خوش تھا کہ وہ چلی جائے گی تو گھر میں مجھے ڈانٹنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ پاپا مجھے کبھی نہیں ڈانٹتے تھے اور میں اپنی من مرضی کروں گا۔ دوپہر میں باغ میں جا کر آم توڑوں گا۔ دن بھر گھوموں گا۔ تالاب میں پتھر پھینکوں گا۔ نوکروں کے بچّوں پر ہاتھ آزماؤں گا۔ کتابیں سب چھپا دوں گا اور ماسٹر جی کو بھگا دوں گا۔ آ.....ہا.....ہا.....ہا.....او.....ہو.....ہو.....کتنا مزہ آئے گا۔ میں کتنا آزاد ہوں گا۔ وقت پر کھانا کھاؤ۔ وقت پر سوؤ۔ اٹھو۔ پڑھو۔ وہ ہر وقت میرے پیچھے حکم کا ڈنڈا لیے چلتی تھی۔

اس کی رخصتی پر سب رو رہے تھے، وہ بھی مجھے گلے لگا کر خوب روئی لیکن میری آنکھیں نم نہ ہوئیں۔ میں سوچ رہا تھا کب اس کی سجی ہوئی کار نظروں سے دور ہو اور کب میں آزادی کا نعرہ لگاتا ہوا میدان میں بھاگ جاؤں اور من مانی کروں۔

اس کا موٹا دولہا مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ جب کہ سب لوگ میرے پیچھے پڑے تھے، اس کے پاس جا کر بیٹھو۔ وہ مجھے گھور رہا تھا، میں اسے گھور رہا تھا۔

میری بہن تو اتنی نازک سی، گوری سی، ایک دم جوہی کا پھول تھی اور یہ موٹا۔ مجھے اس پر بڑا غصہ بھی آ رہا تھا کہ یہ میری بہن کو کیوں لے جا رہا ہے؟ لیکن لے جانے دو جی۔ مجھے کیا؟ ہر وقت کی غلامی سے تو میری جان بچی رہے گی۔ آرام سے خوب دیر تک سو کر صبح اٹھوں گا، نہاؤں گا بھی نہیں۔ سارا کام اپنی مرضی سے کروں گا۔

''ہوں..... بڑی آئیں وہاں کی۔''

اس کی کار دھواں اُگلتی ہوئی، پھولوں سے مہکتی گاؤں کی کچی سڑک پر ڈگمگاتی چلی جا رہی تھی۔ میں باغ کی فصیل پر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ کار کے اوجھل ہوتے ہی میں نے آزادی کا نعرہ بلند کرنا چاہا۔ لیکن نعرے کی آواز میرے حلق میں پھنس گئی۔ نہ جانے کیسے میرا دل درد کی شدت سے کراہ اُٹھا۔ اب میرا کون خیال رکھے گا؟ مجھے کون پیار کرے گا؟ کون صبح صبح لاڈ سے اُٹھائے گا؟ سالگرہ کے دن کون میری پیشانی چومے گا؟ اپنے ہاتھوں سے کون نوالے بنا بنا کر کھلائے گا؟ یکا یک میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ آنسوؤں کا سیلاب سا آ گیا۔ میری قمیص کی دونوں آستینیں بھیگ گئیں۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ میں گھر میں واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہاں میرا کوئی بھی انتظار نہیں کر رہا ہوگا۔ خالی دروازہ میرا استقبال کرے گا۔ کسی کی دو بڑی بڑی روشن آنکھیں چلمن سے جھانک جھانک کر میرا بے چینی سے انتظار نہیں کر

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

رہی ہوں گی۔ پاپا کے کمرے میں موکل ہوں گے۔ وہ مقدمہ سلجھا رہے ہوں گے۔ ان کو کیا فکر، لڑکا مرے یا جیے۔

تبھی میرا پرانا نوکر علی شیر مجھے ڈھونڈتا ہوا آ گیا اور مجھے زبردستی گھر لے گیا۔ میں کمرے میں چپ چاپ پڑا رہا۔ میرے دوست مجھے کھیلنے کے لیے بلانے آئے لیکن میرا دل نہیں چاہا۔ دوپہر میں آم توڑنے بھی نہیں گیا۔ نوکر کھانا لا کر کمرے میں رکھ گیا، میں نے نہیں کھایا۔ میں روتے روتے سو گیا۔ اٹھا تو شام ہو چکی تھی۔ میرا دماغ بوجھل تھا، کچھ کرنے کو طبیعت نہیں ہو رہی تھی۔ خالی بیٹھے بیٹھے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ جھک مار کر میں نے کورس کی کتاب اٹھائی، پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ کان میں کوئی پھسپھسایا۔ ''دل لگا کر پڑھو، امتحان میں اچھے نمبر لانا۔''

''کون ہے بھئی؟'' گھبرا کے کمرے میں دیکھا، میرے علاوہ کوئی نہ تھا۔ تو یہ بولا کون؟ کیا تم ہر جگہ ہو؟ کیا آوازیں بازگشت میں رہ جاتی ہیں؟

صبح میرا ارادہ دیر تک سونے کا تھا۔ لیکن پانچ بجے ہی تمھاری آواز نے مجھے اٹھا دیا..... ''اٹھو دیر تک سونا اچھی عادت نہیں ہے۔'' میں مجبوراً اٹھ بیٹھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ تم کہیں نہیں تھیں۔ یعنی تم میرا پیچھا کبھی چھوڑو گی نہیں۔ چاہے تم یہاں ہو یا نہ ہو، تم ہمیشہ میرے وجود میں ایک خوشبو کی طرح بسی رہو گی۔ جیسا تم چاہتی تھیں میں سارے کام ویسے ہی کرتا تھا۔ تمھاری غیر موجودگی میں بھی۔ میری سالگرہ کے دن بھی تم نے میری پیشانی چوم کر اُٹھایا تھا..... ''سالگرہ مبارک ہو۔''

''ارے..... تم کب آئیں؟'' میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

لیکن تم کہیں نہیں تھیں۔ تو پھر میری پیشانی کس نے چومی؟ ایک دم تمھاری طرح، لیکن کمرہ ہمیشہ کی طرح خالی تھا۔

شام کی ڈاک سے تمھارا پارسل ملا۔ تم نے مجھے زرد رنگ کا پل اوور بھیجا تھا۔ اچھا، تو تم کو یاد تھا کہ مجھے زرد رنگ بے حد پسند ہے۔ اس دن میں ببول کے درخت کے پاس گھنٹوں بیٹھا رہا۔ درخت اپنی بہار پر تھا۔ زرد زرد پھولوں سے ڈھکا ہوا ببول۔ میں پھول توڑتا تھا، تم اپنے کان کی لو میں پھول پہن لیتی تھیں۔ ایک دن تم نے یہ شعر بھی پڑھا تھا:

جنوں پسند مجھے چھانو ہے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

تمھارے کہنے کے مطابق میں پڑھ لکھ کر انسان بن گیا۔ نوکری بھی مل گئی۔ پھر میں پیسے جوڑ کر تم سے ملنے لندن بھی آ گیا۔ تمھارے لیے کچھ لا نہیں سکا تھا، میں تمام دن دلّی کے پالیکا بازار میں گھومتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تمھارے لیے کیا خریدوں؟

تھک کر اپنے کمرے پر لوٹ آیا تھا۔ کمرے میں میری نظر پڑی ایک پاؤڈر کے پرانے ڈبے پر۔ مجھے یاد آیا کہ میں بچپن میں پاؤڈر کے پرانے ڈبے میں شیشے لگا کر تمھاری ٹوٹی چوڑیوں کے ٹکڑے ڈال کر ایک کھلونا بناتا تھا، جس کو ہلانے پر چوڑیوں کے رنگین ٹکڑوں کے مختلف زاویے بنتے تھے۔ وہ تم کو بیحد پسند تھا۔ لیکن میں تم کو وہ کھلونا کبھی نہیں دیتا تھا۔ تمھارے لاکھ اصرار پر بھی نہیں بناتا تھا۔

میں نے بازار جا کر چند رنگین چوڑیاں لیں۔ ان کو توڑ کر تمھارے لیے یہ ایک حقیر سا تحفہ تیار کیا۔

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

تمھارے گھر پہنچ کر مجھے فوراً یہ احساس ہو گیا کہ تمھارے علاوہ میرے آنے سے کوئی خوش نہیں ہوا تھا۔ خیر...... مجھے امید بھی یہی تھی۔ حالانکہ تم بار بار یہی کوشش کر رہی تھیں کہ سبھی لوگ تمھارے بھائی کو تمھاری ہی طرح اہمیت دیں۔

کھلونا پا کر تم رو پڑی تھیں۔ لگتا تھا تمھارے سارے زخم پھر ہرے ہو گئے ہوں۔ گاؤں کی یادوں میں تم ڈوب گئی تھیں۔

''ببول کا پیڑ پچھواڑے ہے کہ نہیں؟''

''وہ کٹ گیا۔''

''سترو چمن کی اماں آتی ہے کہ نہیں؟''

وہ بیٹے میں کب کی مرگئی۔'' میں جھنجھلا گیا تھا۔ یہ بھی کہاں کہاں کی اوٹ پٹانگ باتیں پوچھتی ہے۔ لگتا ہی نہیں کہ لندن میں رہتی ہے۔

کھانا تم نے ہندستانی پکایا تھا۔ میری پسند کی کھانے کی کھیر بھی پکائی تھی، لیکن تمھارے شوہر اور بچّوں نے چکھا بھی نہیں۔ ان لوگوں نے ڈبل روٹی اور سلاد کھائی۔ میں برسوں بعد تمھارے ہاتھوں کی پکی نرم، ملائم، نازک، ذائقے دار چپاتیوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

تم مجھ سے اب بھی بالکل بچّوں سا سلوک کرتی تھیں۔ صبح باقی بچّوں کے ساتھ مجھے اٹھا دیتیں۔ میرے کپڑے دھوتیں۔ پریس کرتیں۔ میرے جوتوں کی لیس بھی ایک دن تم نے باندھنے کی کوشش کی تھی۔

''ارے بھئی میں خود باندھ لوں گا تم مجھے بچّہ مت سمجھا کرو پلیز۔''

''پپّو! تم کتنے بھی بڑے ہو جاؤ، میری نظر میں تو تم ہمیشہ بچّہ ہی رہو گے۔''

اس کی آنکھیں جھل مل ہو گئیں۔ میں نے جوتے کے لیس اس سے بندھوائے۔ بچپن میں میں لیس غلط باندھ لیتا تھا۔ کبھی الجھا لیتا تھا۔ اس لیے وہ باندھتی تھی۔

تمھارے بچّے ہنسے تھے۔ ''ماموں کو لیس بھی باندھنا نہیں آتا۔''

دوسرا بولا۔ ''گاؤں والے ہیں نا۔ اس لیے نہیں جانتے ہوں گے۔''

تم نے بڑے شوق سے ان کو وہ حقیر سا کھلونا دکھایا تھا جو تم کو بے حد عزیز تھا۔ لیکن تمھارے بچّوں نے اس کو حقارت سے دیکھ کر کہا تھا:

''کیا وہاں ایسے ہی بیکار اور گندے کھلونے بنتے ہیں؟''

''ترقی ہوئی کہاں ہے وہاں۔'' تمھاری لڑکی بولی تھی۔

میں چپ چاپ نرم صوفے پر دھنسا جا رہا تھا۔

تم چپ تھیں، شرمندہ تھیں۔ تمھارے شوہر طنزیہ مسکرا رہے تھے۔ ان کے موٹے موٹے بھدّے ہونٹوں پر مسکراہٹ

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

رینگ رہی تھی، لیکن میں..... میں صرف تمھاری طرف دیکھ رہا تھا۔

کتنی کمزور ہوگئی تھیں تم۔ بالوں میں چاندی اتر آئی تھی۔ عام لندن والوں کی طرح تم بال ڈائی نہیں کرتی تھیں۔ حالاں کہ تمھارے شوہر کے بال ڈائی سے چمک رہے تھے۔

ببول کے پھولوں کی طرح تمھارا چہرہ زرد تھا اور میں اتنا مجبور تھا کہ تمھارے لیے کچھ کر نہیں سکتا تھا، چاہتے ہوئے بھی نہیں۔

میں نے تم سب سے اپنے دیش چلنے کو کہا تھا۔ تمھارے شوہر نے فوراً سوری کہہ دیا تھا۔ ''ہم لوگ تو بغیر ایئر کنڈیشن کے زندہ ہی نہیں رہ سکتے ہیں، ایک پل بھی نہیں۔ بچے بھی ان سہولتوں کے عادی ہیں۔ پھر گانو کی تکلیف دہ زندگی یہ لوگ برداشت نہیں کر پائیں گے۔ بیمار ہو جائیں گے۔''

''اچھا جاڑوں میں چلیے۔'' تم نے خود سفارش کی تھی۔

''کھیتوں میں ہمارے گنا اور مونگ پھلیاں ہوں گی۔ بچے بھی خوش ہوں گے۔''

تمھاری آنکھوں میں سرسوں کے کھیت ابھرنے لگے تھے۔ تم کنول کے تالابوں، مٹر کے پھولوں اور چنے کی تیز خوشبو سے ہو کر پھر لوٹ آئی تھیں۔

''جاڑوں میں ہم لوگ پیرس جا رہے ہیں کیوں؟'' تمھارے موٹے شوہر نے بچوں سے کہا۔

''یس۔'' سب چلائے تھے۔

''میں باجی کو لینا جاؤں؟'' میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

میری بہن کے چہرے پر کیسی حیرانی، خوشی، غم، حسرت، مسرت کا ملا جلا جذبہ تھا جس کو بتانا مشکل ہے۔ لیکن تمھارے شوہر نے انکار کر دیا۔ اپنی بھاری بے سُری آواز میں فرمایا۔ ''گھر کے کاموں میں پریشانی ہوگی۔''

تم ایک لفظ بھی نہیں بولی تھیں۔ اٹھ کر چلی گئی تھیں۔ مجھے معلوم ہے تم اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے خوب روئی ہوگی۔ گھر کے سارے کام مشین سے ہوتے ہیں اور اب تو بچے بھی بڑے ہو گئے ہیں۔ خود بھی کچھ نہ کچھ کر سکتے ہیں۔ لیکن میں کچھ کہہ نہیں پایا۔

کھانے کی میز پر جب تم آئیں تو تمھارے ہاتھوں میں لرزش سی تھی اور آنکھوں میں ہلکی سرخی جو تمھارے غم کا ثبوت تھی۔

دوسرے دن مجھے وطن واپس آنا تھا۔ تم زندگی میں پہلی بار میرے شانے پر سر رکھ کر رات بھر روتی رہی تھیں کیوں کہ اس کے علاوہ تم کچھ کر بھی تو نہیں سکتی تھیں۔ کتنی مجبور تھیں تم اور میں.....

کیا کرتا میں بھی۔ تم بتاؤ؟ میں نے کہا تھا۔ ''تم میرے ساتھ چلو اپنے گانو، اپنے دیش۔ چلو تم، میں تم کو لے چلتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کون تمھارے بھائی کو روک سکتا ہے۔''

''نہیں بھیا۔ نہیں چَو..... 'وہ' ناراض ہو جائیں گے۔''

'وہ' کم بخت 'وہ'..... تم کو اپنے 'وہ' کا اتنا ہی خیال ہے۔ ان کی مرضی کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتیں تو بھول جاؤ ہم

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

سب کو، ہم دیہاتی ہیں، جاہل ہیں، غریب ہیں۔ بھول جاؤ اپنے گھر کو، اپنے کھیتوں کو، اپنے لوگوں کو، کھو جاؤ یہاں کی رنگین فضا میں، ڈوب جاؤ مستیوں میں، بے ہنگم موسیقی میں، بے معنی زندگی میں۔ جہاں سب کچھ صرف پیسہ ہے۔ انسانی جذبات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ کیوں جُوی ہو تم ابھی تک اپنی قدروں سے؟"

"میری جڑیں تو وہیں ہیں بھیّا..... میرا وجود بھی وہیں ہے، میری روح بھی وہیں ہے، صرف میرا جسم ہی تو یہاں آ گیا ہے..... میں کیسے تم سب کو بھول سکتی ہوں؟"

مجھے اپنے سینے سے لگایا تھا تم نے، میں ایک بچہ بن کر کاش تمھارے پاس تمام عمر رہ سکتا، کاش یہ لمحہ کبھی ختم نہ ہوتا۔ میں یوں ہی تمھاری آغوش میں سر رکھے رکھے مر جاتا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ صبح سورج نکل آیا۔ بلا وجہ ہی میں چاہتا تو اور چھٹی لے کر رُک سکتا تھا، لیکن تمھارے شوہر کے چہرے پر میرے رہنے سے نفرت کا جو جذبہ اُبھرتا تھا، وہ چاہے خود نہ پڑھ سکتا ہو لیکن ایک عام ہندستانی ضرور پڑھ سکتا تھا کیوں کہ ہندستان صرف دلوں کا دیش ہے، جذبوں کا دیش ہے، محبت کا دیش ہے، خلوص کا دیش ہے۔

رات میں کئی بار میرے دل میں خیال آیا کہ میں تمھارے 'وہ' کی موٹی گردن اپنے مضبوط توانا ہاتھوں سے دبا دوں، جب نیلی موٹی موٹی رگیں اُبھر آئیں تو چھوڑ دوں اور تم کو ہندستان لے جاؤں۔ خود چاہے تمام عمر جیل میں رہوں، کم از کم اس فرعون سے دنیا تو پاک ہوگی۔

لیکن تمھیں بیوہ کیسے دیکھ سکوں گا؟ تم رنگیں کے بجائے سفید ساڑی پہنو گی۔ تمھارے کانوں میں ببول کے پھول کی طرح زرد کرن پھول ہیں جو اماں کے جہیز کے ہیں، ان کو اتارنا پڑے گا۔ رنگین چوڑیاں تم کو بچپن سے بے حد پسند ہیں۔ میلہ جاتے وقت تم ہمیشہ مجھ سے چوڑیوں کی فرمائش کرتی تھیں۔ ہر رنگ کی چوڑیاں تھیں تمھارے پاس۔ تمھارے خالی، سُونے ہاتھ کیسے لگیں گے؟..... نہیں..... نہیں..... میں تمھاری وجہ سے تمھارے 'وہ' یعنی فرعون کا خون نہیں کر رہا ہوں۔

ائیر پورٹ پر بھی وہ موٹا لٹھا ہوا مجھے چھوڑنے نہیں آیا۔ اس کو وقت نہیں تھا۔ صرف تم آئی تھیں۔ یہی میں چاہتا بھی تھا۔ چلتے وقت تم نے میری پیشانی چوم لی۔ ہاتھ میں چپکے سے صدقے کے روپے تھما دیے۔

میں جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تم چلی گئی ہوگی۔ تم کپڑے دھو رہی ہوگی۔ کھانا پکا رہی ہوگی۔ تمھارے 'وہ' ٹی وی پر کوئی بلو فلم دیکھ رہے ہوں گے۔ تمھارے بچے ریکارڈ لگا کر کسی افریقی دھن پر ناچ رہے ہوں گے۔ تم میرے خیریت سے گھر پہنچنے کی دُعا کر رہی ہوگی۔

میں تمھاری یادوں کا خوشگوار بوجھ لے کر اپنی سرزمین پر آ گیا ہوں..... اور کھیتوں کو، گھر کو، ستر وھن کی اماں کو، پاپا کو، کٹے ببول کے درخت کو تمھارا اسلام..... تمھاری عقیدت و محبت پیش کر رہا ہوں۔

لفظ و معنی

غزال - نوجوان ہرن

ضیغم - کڑوا، بدذائقہ، شیر

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

بے خودی - بے ہوشی، حالتِ وجد، بے خبری کا عالم
شدّت - زور، غلبہ، تیزی، کثرت
چلمن - چق، تیلیوں کا بنا ہوا پردہ
مُوکل - وہ شخص جو وکیل مقرر کرے
بازگشت - واپسی، پھر کر آنا، لوٹنا، پیچھے رہنا
اصرار - تکرار، کسی امر میں بار بار تاکید، ضد کرنا
حقیر - چھوٹا، ادنا، دبلا، ذلیل، خوار
حقارت - سبکی، ذلّت
حسرت - کسی چیز کے نہ ملنے کا افسوس
لرزش - رعشہ، کپکپی، تھرتھراہٹ
بے ہنگم - بے ڈول، بھونڈا، بے موقع

آپ نے پڑھا

- "خوشبو" غزال ضیغم کے افسانوی مجموعہ "ایک ٹکڑا دھوپ کا" سے لیا گیا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ بھائی، بہن اور اپنے ملک کی محبت سے لبریز ہے۔ بھائی کی زبانی کہانی بیان کی گئی ہے۔ بچپن میں ماں کا انتقال ہو جاتا ہے۔ بڑی بہن صرف آٹھ سال بڑی ہے، چھوٹے بھائی کی پرورش کرتی ہے اور ممتا کے پھول نچھاور کرتی ہے۔ وہ اپنی بہن کی اس محبت اور شفقت کو فراموش نہیں کر پاتا۔ جیسے ہی وہ اپنے پانو پر کھڑا ہوتا ہے، وہ بہن سے ملنے لندن پہنچ جاتا ہے۔ وہاں جانے کے بعد اپنے پرائے اور دیس بدیس کا فرق اُسے اچھی طرح سمجھ میں آجاتا ہے۔
- "خوشبو" میں رشتوں کی جذباتی گرفت کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ایک عورت کے اندر خاندان کی عزّت، بھائی سے محبت، شوہر سے وفاداری اور ماں کی ممتا جیسی ہزار خوبیاں پنہاں ہوتی ہیں۔ "خوشبو" میں اُن ذمّے داریوں کا احساس اور اسی کے پہلو بہ پہلو ازدواجی زندگی کی کشاکش کو نہایت خوب صورتی کے ساتھ برتا گیا ہے۔
- اگر "خوشبو" لہو کے رشتے کی خوشبو سے گرم اور برقرار ہے تو دیگر خوشبوؤں کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دھان کے کھیت کی دھانی دھانی خوشبو، پتوں کی ہری ہری خوشبو، سردیوں میں گلابی گلابی خوشبو، دھواں کی تلخ سی کسیلی خوشبو، روٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو، سوئٹر میں ممتا کی خوشبو، بھائی کے وجود میں بہن کے پیار کی خوشبو، شوہر کے لیے وفا کی خوشبو، بچوں کے لیے شفقت کی خوشبو سدا برقرار ہے۔
- "خوشبو" میں افسانہ نگار نے مشرقی اور مغربی تہذیب کے تصادم کو بھی بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مادیت پسندی نے انسانی جذبات کو بے وقعت کر دیا ہے۔ رشتوں کی اہمیت کو پسِ پشت ڈال کر مغرب نے ہماری تہذیبی

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

زندگی کے وجود پر سوالیہ نشان قائم کر دیا ہے۔ افسانہ نگار نے اس مسئلے پر نہایت ہمدردانہ انداز میں غور کیا ہے۔

غزال ضیغم موجودہ عہد میں اردو کی اہم خواتین افسانہ نگاروں میں شمار ہوتی ہیں۔ ان کی نگاہیں معاشرے میں فنا ہوتے جذبوں اور مٹتی ہوئیں اقدار پر مرکوز رہتی ہیں جنھیں وہ اپنے افسانوں میں بڑی سادگی اور خوبصورتی کے ساتھ اُجاگر کرتی ہیں۔

آپ بتایئے:

1- ''خوشبو'' افسانہ کس نے لکھا؟
2- کس افسانوی مجموعے سے ''خوشبو'' اخذ کیا گیا ہے؟
3- افسانے کی مصنفہ 'غزال ضیغم' کے نام کے کیا معنی ہیں؟
4- اس افسانے کا مرکزی کردار کون ہے؟
5- ستر وھن کی اماں پپّو کے گھر کیوں نہیں آئی؟
6- بھائی، بہن سے عمر میں کتنے برس چھوٹا ہے؟
7- بہن کی شادی کہاں ہوئی؟
8- علی شیر سے پپّو کا کیا تعلق تھا؟
9- تحفہ خریدنے کے لیے پپّو کہاں دن بھر گھومتا رہا؟
10- بھائی، بہن کو کیا تحفہ دیتا ہے؟
11- سالگرہ کے دن کسے پارسل موصول ہوا؟
12- پل اوور کا رنگ کیسا تھا؟
13- اس افسانے میں کن کن ملکوں کے کھانے کا تذکرہ ہے؟
14- افسانہ ''خوشبو'' میں کن کن خوشبوؤں کا ذکر ملتا ہے؟

صحیح جوڑے ملایئے۔

(الف) شام کی ڈاک سے	(۱) عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی
(ب) کمرے میں میری نظر پڑی	(۲) تمھارا چہرہ زرد تھا
(ج) جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی	(۳) زندہ ہی نہیں رہ سکتے ہیں
(د) ہم لوگ تو بغیر ایر کنڈیشن کے	(۴) تمھارا پارسل ملا
(ر) ببول کے پھولوں کی طرح	(۵) ایک پاوڈر کے پرانے ڈبے پر

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

مختصر گفتگو

1- افسانہ ''خوشبو'' میں کس طرح کی کہانی پیش کی گئی ہے؟

2- بچہ اپنی آزادی کا متلاشی کیوں تھا؟

3- افسانہ ''خوشبو'' میں کس کی محبت کو اُجاگر کیا گیا ہے اور کیوں؟

4- بہن کی شادی کی خبر سُن کر بھائی کیوں خوش ہوا؟

5- لندن میں بھائی کے ساتھ گھر والوں کا رویہ کیسا تھا؟

6- اس افسانے کا نام ''خوشبو'' کیوں رکھا گیا؟

7- بہن اپنے بھائی سے ملنے پر ویسے سوالات کیوں کرتی ہے جن سے پپّو جھنجھلا اٹھتا ہے؟

8- پرانے ڈبّے سے بنے کھلونے میں ایسا کیا ہے کہ بھائی اسے دوسری تمام چیزوں پر فوقیت دیتا ہے اور اِسے اپنی بہن کے لیے بہ طور تحفہ لے جاتا ہے؟

9- پپّو کی بہن اور اُس کے گھر کے دوسرے تمام افراد کے خیالات میں تضاد کیوں ہے؟

10- ''خوشبو'' افسانے کے عنوان سے آپ کس حد تک متفق ہیں؟

تفصیلی گفتگو

1- افسانہ سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

2- افسانہ کے فن سے بحث کرتے ہوئے 'خوشبو' کا جائزہ لیجیے؟

3- ''خوشبو'' افسانے کے سماجی پہلوؤں پر گفتگو کریں؟

4- مشرقی اور مغربی تہذیب کے فرق کو اس افسانے کے حوالے سے واضح کریں؟

آیئے، کچھ کریں

1- اس افسانے میں کن کن خوشبوؤں کا ذکر آیا ہے؟ ان کی فہرست بنایئے۔

2- مغربی اور مشرقی ممالک کے کھانوں کی فہرست بنایئے۔

3- مصنفہ نے اس افسانے کو بھائی کی زبان میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اس افسانے کو بہن کی زبان میں ادا کرنے کی کوشش کیجیے۔ حسب ضرورت آپ تبدیلیاں بھی لا سکتے ہیں لیکن مرکزی خیال مجروح نہیں ہونا چاہیے۔

4- اردو کی خواتین افسانہ نگاروں کی ایک فہرست تیار کیجیے اور عہد بہ عہد ارتقا کی صورتوں کو نشان زد کرنے کی کوشش کیجیے۔ اس کام کے لیے اردو ادب کی تاریخ سے متعلق کسی کتاب سے بھی استفادہ کیجیے۔

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

تکشی شیو شنکر پلّے

ملیالی زبان کے معروف نثر نگار تکشی شیو شنکر پلّے 17 اپریل 1912ء کو ''امے پین'' کیرل کے ایک گانو ''تکشی'' میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گانو سے شروع کی۔ قانون کی ڈگری تری ولارم سے حاصل کرنے کے بعد وہاں وکالت کرنے لگے۔ 10 اپریل 1999ء کو اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

اسکول کے ایک ٹیچر کے۔ کمار پلّے کے مشورے سے وہ نثر نگاری کی جانب مائل ہوئے۔ ان کی پہلی کہانی ''نردھن'' (ملیالی زبان میں ''سادھو کل'') 1929ء میں رسالہ ''سروس'' میں شائع ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۷ برس تھی۔ 1934ء میں ''پرتی بھلم'' کے نام سے ان کا پہلا ناول شائع ہوا۔ انھوں نے کل 32 ناول لکھے جن میں ''چے مین'' (1955ء)، ''آ کشم'' (1967ء)، ''اینی پڑ ہکل'' (1964ء)، ''دھرم ندھیو'' (1970ء) اور ''کیر'' (1978ء) بہت مشہور ہیں۔ تین جلدوں میں انھوں نے اپنی خود نوشت بھی لکھی۔

تکشی شیو شنکر پلّے کی بنیادی شہرت بلاشبہ ناول نویس کی حیثیت سے ہے لیکن انھوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا افسانہ نگاری سے کی تھی۔ ان کی پہلی مطبوعہ کتاب ان کے چند افسانوں کا مجموعہ ''پوتھو ملار'' ہے جو 1934ء میں شائع ہوا۔ تریوندرم (ترواننت پورم) میں وکالت کی تعلیم کے دوران تکما بال کرشن پلّے کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے جو ملیالی زبان کے معتبر رسالے ''کیسری'' کے مدیر تھے اور ملیالی کے نوجوان ادیبوں کے مشیر بھی تھے۔ ان کی ابتدائی کہانیاں بھی اسی رسالے میں شائع ہوئیں جن میں ''سیلاب'' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

تکشی نے اپنے فن میں سادگی کو بنیادی اہمیت عطا کی اور ہماری عوامی زندگی کے مظاہر کو اپنے ادب میں بغیر کسی نقش و نگار کے اس طرح پیش کیا کہ ان کا فطری رنگ اُجاگر ہو جائے۔ فکشن کی تاریخ میں ایسے لوگ بڑی تعداد میں نہیں ہیں جنھوں نے انشا پردازی، تکنیکی سحر کاری اور فکر و فلسفہ کے دقیق مسئلوں میں الجھے بغیر کوئی بڑی تحریر پیش کر دی ہو۔ تکشی کی اصل بڑائی اس بات میں ہے کہ انھوں نے دیہی سماج کے جیتے جاگتے، سچے اور بے رنگ چہروں کو اپنے افسانوں میں شامل کیا۔ ہندستان کی مختلف زبانوں میں تکشی کی کتابوں کے تراجم دستیاب ہیں۔

تکشی کی کہانیوں کے مرکزی کردار اکثر انجانے چہرے ہوتے ہیں۔ قصہ نویسی کے دوران وہ ان مقامات پر زیادہ توجہ دیتے ہیں جنھیں دوسرے لکھنے والے غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ پریم چند کے اچھے خاصے اثرات ان پر ہیں اور 1948ء میں انھوں نے پریم چند کے ناول ''نرملا'' پر اپنے تاثرات شائع کرائے تھے۔ ملیالی زبان میں انھیں سب سے اہم فکشن نویس کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ 1956ء میں ''چے مین'' ناول پر ساہتیہ اکادمی کا انعام حاصل ہوا اور 1984ء میں بھارتیہ گیان پیٹھ نے انھیں مجموعی خدمات کے اعتراف میں اپنے انعام سے نوازا۔

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

تکشی شیو شنکر پلّے   ترجمہ (ملیالی کہانی)

سیلاب

گانو میں اونچی جگہ پر ایک مندر ہے۔ وہاں دیوتا گلے تک پانی میں ڈوبا کھڑا ہے۔ پانی، ہر جگہ پانی ہی پانی ہے۔ تمام گانو والے بسیرا ڈھونڈنے چلے گئے ہیں۔ جس کے گھر ناو ہے، اس کے یہاں گھر کی رکھوالی کے لیے ایک آدمی رہ گیا ہے۔ مندر کے تین کمروں والی چھت پر 67 بچے تھے۔ تین سو چھپّن لوگ، کُتا، بلّی، بکری اور مرغے جیسے پالتو جانور، سبھی مل جُل کر رہ رہے تھے۔ کوئی جھگڑا نہیں تھا۔

چنّن کو پانی میں کھڑا ہوئے ایک رات اور ایک دن ہو گیا۔ اس کے پاس ناو نہیں ہے۔ اس کے ججمان کو جان بچا کر کنارے پہنچے تین دن ہو گئے۔ جب پانی جھونپڑے میں داخل ہونے کو ہوا تو ٹہنیوں اور لٹھوں سے تاک اور مچان بنالی تھی۔ یہ سوچ کر کہ پانی جلدی اُتر جائے گا، وہ دو دن تک اسی پر بیٹھا رہا۔ اس کے علاوہ چار پانچ کیلے کا گچھا اور پھوس کا انبار بھی تو تھا جس کی حفاظت اُسے کرنی تھی۔ اگر وہ وہاں سے چل دیا تو ساری چیزیں کوئی چالاک اُڑالے جائے گا۔

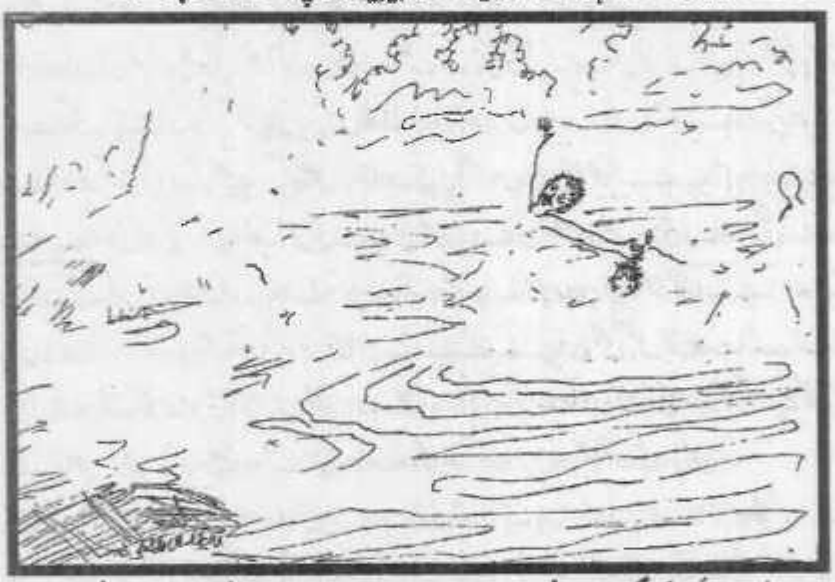

اب تو تاک اور مچان پر بھی گھٹنا بھر پانی ہے۔ چھپّر چھانے والے ناریل کے پتوں کی دو قطاریں پانی کے نیچے ہیں۔ اندر سے چنّن چلّایا، لیکن سُنے گا کون؟ پاس ہے کون؟ حاملہ بیوی، چار بچے، ایک بلّی اور ایک کُتا.......... اتنے ذی حیات اُسی کے بھروسے ہیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ جھونپڑے کے اندر سے پانی نکلنے میں تیس گھنٹے سے کم نہیں لگیں گے۔ اب تو اپنا اور کنبے کا خاتمہ سر پر ہے۔ موسلا دھار بارش تین دنوں سے لگاتار ہو رہی ہے۔ جھونپڑے کے اوپر سے ناریل کے پتّے ہٹا کر چنّن کسی طرح باہر آیا۔ شمال کی طرف بڑی ناو جا رہی تھی۔ اس نے زور لگا کر ناو والوں کو پکارا۔ ناو والے، خوش قسمتی سے وہ بات سمجھ گئے۔ انھوں نے ناو جھونپڑے کی طرف موڑ دی۔ چنّن

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

اپنے بچوں، بیوی، کتے اور بلی کو ایک ایک کرکے چھپّر سے باہر لے آیا۔ تب تک ناؤ بھی آگئی۔

بچے ناو پر چڑھنے لگے۔ "چنن بھائی، سنو ذرا!" مغرب کی طرف سے کوئی پکار رہا تھا۔ چنن نے مڑ کر دیکھا۔ "ادھر آؤ!!" وہ گُپ چُپ سَن تھا۔ اپنی مچان پر سے پکار رہا تھا۔ چنن نے بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اسے ناو پر بٹھایا۔ اسی تاک میں بلی بھی ناو پر چڑھ گئی۔ کسی کو کتا یاد نہیں آیا۔ وہ جھونپڑے کے پچھلے حصے میں ادھر اُدھر کچھ سونگھتا چل رہا تھا۔

ناو چل پڑی۔ کتا چھپّر پر لوٹ آیا۔ تب تک چنن کی ناو دور جا چکی تھی۔ وہ جیسے اُڑ رہی تھی۔ کتا دل سوز تکلیف سے کِکیانے لگا۔ بے سہارا آدمی کی طرح اُس نے آواز دی۔ کون تھا اُسے سُننے کو؟ جھونپڑے کے چاروں طرف وہ گھوما۔ کہیں کہیں سونگھا اور پھر کِکیانے لگا۔

ایک مینڈک آرام سے مچان پر آبیٹھا تھا۔ یہ غیر متوقع شور و غل سُن کر وہ ڈر گیا اور کتے کے سامنے سے پانی میں کود پڑا، دھم.... کتا ڈر کر کانپنے لگا اور پیچھے اچک کر پانی کو دیکھتا رہا، پانی ہل رہا تھا۔

شاید کھانا کھوج رہا ہوگا۔ کتا اِدھر اُدھر سونگھنے لگا۔ کوئی مینڈک اس کی ناک میں پیشاب کر کے پانی میں کود گیا۔ کتے کو بے چینی میں چھینکیں آنے لگیں۔ وہ سر ہلا ہلا کر چھینکا۔ پھر آگے کے پیر سے اس نے منھ پونچھ لیے۔

موسلا دھار بارش پھر شروع ہوگئی۔ کتا اُکڑوں بیٹھ کر برداشت کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کا مالک 'اُمپ لپشا' پہنچ چکا تھا۔

رات ہوگئی۔ ایک خوف ناک گھڑیال پانی میں نصف ڈوبی جھونپڑی کو چھوتے ہوئے آہستہ سے بہہ گیا۔ کتا خوف سے دُم ہلاتے ہوئے بھونکا۔ گھڑیال بہہ گیا جیسے وہ کچھ نہیں جانتا ہو۔ مچان پر اُکڑوں بیٹھا کتا بھوک سے بے چین ہو کر کالے بادلوں اور اندھیرے سے بھرے ماحول کو دیکھ کر کِکیا اُٹھا۔ اُس کی بے چارگی بھری رونے کی آواز دور تک سُنائی دے رہی تھی۔ ہمدردی میں ہوا اُسے لے کر آگے بڑھی۔ گھر کی حفاظت کرنے والے لوگوں نے کہا ہوگا۔ ہائے! چھت پر بیٹھا کتا کِکیا رہا ہے۔ سمندر کے کنارے اس کا مالک اسی رات کا کھانا کھا رہا ہوگا۔ کھانا ختم کر کے اس نے اپنے کتے کے لیے آج بھی مٹھی بھر بھات الگ رکھ چھوڑا ہوگا۔

کتا کچھ دیر تک لگاتار اونچی آواز میں کِکیاتا رہا۔ پھر آواز ہلکی ہو کر بند ہوگئی۔ شمال کی سمت کوئی اپنے گھر بیٹھے رامائن سُنا رہا تھا۔ کتے نے اس طرف دیکھا، جیسے وہ اُسے سُن رہا ہو۔ وہ گلا پھاڑ کر دوسری بار بھی تھوڑی دیر کِکیایا۔

خاموش رات میں میٹھی آواز میں رامائن پڑھے جانے کی آواز ایک بار پھر سُنائی پڑی۔ کتا کان لگا کر دیر تک اُسے سُنتا رہا۔ ٹھنڈی ہوا میں وہ خاموش میٹھی آواز تحلیل ہوگئی۔ ہوا کے جھونکے اور لہروں کی آواز کو چھوڑ کر اور کچھ سنائی نہیں پڑا۔

مچان کے سب سے اوپر چنن کا کتا سو گیا اور لمبی سانسیں لینے لگا۔ بیچ بیچ میں وہ مایوس ہو کر کِکیاتا بھی رہا۔ اسی وقت مینڈک نے چھلانگ لگائی۔ کتا دوبارہ بے چین ہو اُٹھا۔

صبح ہوگئی۔ کتا دھیمی آواز میں پھر کِکیانے لگا۔ اُس نے دِل سوز راگ چھیڑا۔ پانی کی سطح پر اُچھلتے کودتے مینڈکوں کو وہ ٹکٹکی لگا کر دیکھتا رہا۔

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

پانی کے اوپر دکھائی دے رہے جھونپڑے کے پتوں کو اُس نے حسرت سے دیکھا۔ ہر طرف ویران۔ کہیں پر چولھا بھی نہیں جل رہا تھا۔ کتا اُن مکھیوں کو پکڑ رہا تھا جو اُس کے بدن کو خوشی سے کاٹ رہی تھیں۔ پچھلے پیروں سے منھ کو بار بار کھجلا کر وہ مکھیوں کو بھگانے لگا۔

تھوڑی دیر کے لیے سورج نکلا۔ صبح کی دھوپ میں وہ تھوڑا سویا بھی۔ اُس کیلے کے پتے کا سایہ مچیا پر پڑ رہا تھا جو نرم ہوا میں ہل ڈول رہا تھا۔ کتا اُس پر بھی لپک اُٹھا۔ وہ ایک بار پھر بھونکا۔

بادلوں سے سورج چھپ گیا۔ سب جگہ اندھیرا۔ ہوا نے پانی میں لہریں پیدا کر دیں۔ پانی کی سطح پر جانوروں کی لاشیں بہہ رہی تھیں۔ لہروں میں پڑ کر اُن کا بہاؤ اور تیز ہو گیا تھا۔ وہ ہر طرف بے روک ٹوک بہتی جا رہی تھیں۔ کتے نے حسرت سے ان سب کو دیکھا اور پھر کیکیانے لگا۔

دور کہیں کوئی چھوٹی ناؤ تیزی سے جا رہی تھی۔ وہ اُٹھ کر دُم ہلانے لگا۔ اس ناؤ کی رفتار دیکھنے لگا مگر وہ جلدی ہی غائب ہو گئی۔

پانی برسنے لگا۔ کتے نے اُکڑوں بیٹھ کر چاروں طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے کسی کو بھی رُلا دینے والی بے بسی کی کیفیت ظاہر ہو رہی تھی۔

بارش ختم ہو گئی۔ اُتر کے گھر سے ایک چھوٹی ناؤ آئی اور ناریل کے درخت کے پاس رُک گئی۔ کتا دُم ہلاتے اور جمائیاں لیتے ہوئے کیکیایا۔ ناؤ والا ناریل کے پیڑ پر چڑھ کر کچے ناریل توڑنے کے بعد نیچے اُترا۔ وہ ناؤ پر ہی ناریل کا پانی پی کر چتوار لے کر ناؤ کھینے لگا۔

دور کسی پیڑ کی ٹہنی سے ایک کوّا اُڑ کر آیا اور اُس سڑی گلی لاش پر اُترا جو ایک موٹے بھینسے کی تھی۔ کتا خوشی سے اُسے دیکھ کر بھونک اٹھا۔ کوّا بھینسے کا گوشت نوچنے لگا تھا۔ پھر مطمئن ہو کر وہ بھی اُڑ گیا۔

ایک ہری چڑیا جھونپڑے کے پاس کھڑے کیلے کے پیڑ پر آ بیٹھی اور چہکنے لگی۔ کتا بے چین ہو کر پھر بھونکا۔ وہ چڑیا بھی اُڑ گئی۔

پہاڑوں سے آ رہے پانی پر چیتیوں کا ایک جھنڈ تھا جو جا کر جھونپڑے میں پھنس گیا۔ پھر بچ گیا۔ کھانے کی چیز سمجھ کر کتا اُسے سونگھنے لگا۔ وہ ایک دم چھینک اُٹھا، اس کا چہرہ لال ہو کر تھوڑا سا سوج گیا تھا۔

دوپہر بعد، ایک چھوٹی ناؤ میں دو آدمی اُس طرف آئے۔ کتا دُم ہلا کر انھیں دیکھ کر بھونکنے لگا۔ وہ اپنی زبان میں کچھ بولا جو انسان جیسی تھی۔ پانی میں اُتر کر ناؤ چڑھنے کو وہ تیار کھڑا تھا۔ ''دیکھ، ایک کتا کھڑا ہے۔'' اُن میں سے ایک نے کہا۔ کتا ایک بار پھر کیکیایا، جیسے وہ ان کی ہمدردی کا شکریہ ادا کر رہا ہو۔ ''وہیں رہنے دے۔'' دوسرے آدمی نے کہا۔ کتا منھ بند کر کے کچھ بولنے لگا، ایک دو بار اُس نے کودنے کی کوشش بھی کی۔

ناؤ دور چلی گئی۔ کتا پھر ایک بار کیکیایا۔ ناؤ والوں میں ایک نے مڑ کر دیکھا۔

''ہائے!''

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

یہ ناؤ والے کی نہیں، کُتّے کی آواز تھی۔

"ہائے!"

اس کی تھکی ماندی اور دل چھونے والی بے بس رُلائی دور ہوا میں ڈوب گئی۔ پھر لہروں کا لامتناہی شور۔ کسی نے پھر مُڑ کر نہیں دیکھا۔ کُتّا اُسی طرح، ناؤ کے غائب ہو جانے تک کھڑا رہا۔ وہ بھونکتا ہوا مچان پر چڑھ گیا، جیسے کہہ رہا تھا کہ اب دنیا سے آخری وداع لے رہا ہے۔ شاید کہہ رہا ہو کہ وہ آگے کبھی کسی آدمی کو پیار نہیں کرے گا۔

اس نے تھوڑا پانی پیا، پھر اوپر اڑنے والی چڑیوں کو دیکھا۔ لہروں میں بہتا ہوا ایک سانپ اُس کے پاس آیا۔ کُتّا جھٹ سے مچان پر جا پہنچا۔ چنّن اور اس کا خاندان جس سوراخ سے باہر نکلے تھے، اُسی سے سانپ اندر چلا گیا۔ کتّے نے سوراخ کی طرف جھانکا۔ وہ پھر بھونکنے لگا۔ پھر کِکیایا۔ اُس کی آواز میں جان کا خوف اور بھوک دونوں تحلیل ہو گئے تھے۔ وہ زبان، کسی بھی زبان کا بولنے والا، یہاں تک کہ ستارے کی مخلوق بھی سمجھ سکتی تھی۔ اتنی پُر اثر تھی اُس کی زبان۔ رات ہو گئی۔ خوف ناک طوفان آیا۔ دو بار کُتّا اوپر سے نیچے گرتے گرتے بچا۔ ایک لمبا سر پانی کے اوپر اٹھا۔ وہ ایک گھڑیال تھا۔ کُتّا جان کے خوف سے بھونکنے لگا۔ پاس ہی کہیں مرغیوں کی ایک ساتھ رونے کی آواز سُنائی دی تھی۔

"کُتّا کہاں سے بھونک رہا ہے؟ یہاں سے لوگ گئے نہیں کیا؟" کیلے کے پیڑ کے پاس ایک ناؤ آئی جو پھوس، ناریل اور کیلوں سے بھری ہوئی تھی۔

کُتّا ناؤ والوں کی طرف مُڑ کر بھونکنے لگا۔ وہ غصّے میں، دُم اٹھائے، پانی کے پاس گیا اور پھر بھونکا۔ ناؤ والوں میں سے ایک کیلے کے پیڑ پر چڑھ گیا۔

"بھائی، لگتا ہے کہ کُتّا لپکے گا۔"

کُتّا آگے کی طرف لپکا بھی۔ کیلے پر سے وہ آدمی گر پڑا۔ دوسرے نے اُسے ہاتھ دے کر ناؤ پر چڑھایا۔ اتنی دیر میں کُتّا تیر کر مچان پر جا پہنچا اور بدن جھٹکتے ہوئے غصّے سے بھونکنے لگا۔ چوروں نے کیلے کے گچھے کاٹ لیے۔ "تجھے مل جائے گا۔" گلا پھاڑ بھونک رہے کتّے سے اُنھوں نے کہا۔ پھر اُنھوں نے پھوس ناؤ میں ڈالا۔ آخر میں ایک آدمی مچان کے اوپر چڑھا تو کتّے نے اس کا پانو اس طرح بھنبھوڑا کہ اس کے منہ میں گوشت بھر گیا۔ "ہائے!" وہ آدمی روتے ہوئے کود کر ناؤ پر چڑھا۔ ناؤ میں کھڑے آدمی نے پتوار لے کر کتّے کے پیٹ پر دے مارا۔

"کیں۔۔۔کیں۔۔۔کیں!" کتّے کی آواز مدھم ہو گئی۔ کتّے نے جسے کاٹا تھا، وہ ناؤ پر رو رہا تھا۔

"ارے! چپ رہ۔ کوئی۔۔۔۔۔۔" دوسرے نے اُسے دلاسا دیا۔ وہ آگے بڑھ گئے۔

بہت دیر بعد کتّے نے اس طرف دیکھا اور بھونکا جہاں سے ناؤ چلی گئی تھی۔

آدھی رات کے قریب کا وقت۔ ایک جانور کی لاش بہتی ہوئی جھونپڑے سے آ لگی۔ کُتّا اُسے اوپر سے دیکھ رہا تھا۔ وہ نیچے نہیں اترا۔ لاش آہستہ آہستہ بہنے لگی۔ کُتّا کِکیایا۔ ناریل کے پتّے کو اس نے چھیلا۔ دُم ہلائی۔ جھونپڑے سے ہٹ رہی لاش

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

کے پاس گیا اور دانتوں سے اُسے نزدیک کھینچ کر کھانے لگا۔ خوف ناک بھوک مٹانے کو اُسے کافی غذا مل گئی تھی۔

'ٹھے'، ایک زور کی آواز!

کتا دکھائی نہیں پڑا۔ جانور کی لاش تھوڑی ڈوب کر بہہ گئی۔

تب سے صرف طوفان کا شور، مینڈک کی ٹرّاہٹ اور لہروں کی آواز ہی سنائی دے رہی تھی۔ اور کچھ نہیں۔ ہر طرف خاموشی۔ گھر کی حفاظت کرنے والے لوگوں نے پھر کتے کی رُلا دینے والی آواز نہیں سُنی۔ سڑی گلی لاشیں پانی کی سطح پر اِدھر اُدھر بہہ رہی تھیں۔ کسی پر بیٹھا کوّا گوشت نوچ نوچ کر آرام سے کھا رہا تھا۔ کوئی دشواری یا ممانعت نہیں تھی۔ چوروں کو بھی اپنے کام میں خلل نہیں پڑا۔ ہر طرف سناٹا!

تھوڑی دیر بعد وہ جھونپڑا گر پڑا اور پانی میں ڈوب گیا۔ تاحدِ نظر سوائے پانی، کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اپنے مالک کے گھر کی حفاظت اس وفادار کتے نے آخری سانس تک کی۔ وہ چلا گیا۔ لیکن جھونپڑا تب تک پانی کی سطح پر کھڑا رہا جب تک اُس کتے کو گھڑیال نے پکڑ نہیں لیا۔ اب وہ پانی میں بالکل ڈوب چکا تھا۔

پانی اُترنے لگا۔ چنن کتے کو تلاش کرتا ہوا وہاں آیا۔ ایک ناریل کے پیڑ کے نیچے کتے کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ لہریں اُسے دھیرے دھیرے کھسکا رہی تھیں۔ پانو کے انگوٹھے سے چنن نے اُسے ہلایا، اُسے الٹ کر دیکھا۔ اُسے یقین نہیں ہو سکا کہ یہ اُسی کا کتا ہے۔ اُس کا ایک کان کٹ گیا تھا۔ کھال سڑ جانے سے رنگ کا بھی پتا نہیں چل رہا تھا۔

لفظ و معنی

ججمان – لفظ 'یجمان' کا بدلا روپ بہ معنی یگیہ کرانے والا۔ موجودہ دور میں ہندو قوم میں پوجا پاٹھ کے لیے برہمن کو مدعو کرنے والا شخص، اُس برہمن کا ججمان کہا جاتا ہے۔

انبار – ڈھیر

قطار – صف، ترتیب، سلسلہ

بھنبھوڑنا – درندہ جانور کا کسی کا دانتوں سے کاٹنا، پھاڑنا، نوچنا

لامتناہی – جس کی کوئی انتہا نہ ہو

وداع – رخصت

تحلیل – گھل جانا، ہضم ہو جانا

آپ نے پڑھا

- سیلاب میں گھری زندگیوں کی یہ ایک مختصر کہانی ہے۔ افسانہ نگار نے تباہی اور بربادی کی کوئی لمبی چوڑی داستان نہیں سنائی۔ اُس نے نقصانات کا کوئی تفصیلی گوشوارہ تیار نہیں کیا۔ ایک جانور (کتے) کو مرکزیت عطا کر کے تکشی شیو شنکر پلّے نے اس افسانے کو بشر دوست شہ پارہ بنا دیا ہے۔ رحم دلی، وفاداری، ایثار اور احساسِ ذمّے داری کو

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

اس افسانے میں بالکل انوکھے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

- دنیا میں مختلف جانوروں میں کتے اور گھوڑے کی وفاداریاں مشہور ہیں۔ دونوں جانور اپنے مالک کے وفادار ہوتے ہیں۔ اپنے آقا کی جان و مال کی حفاظت میں اپنی جان کو نچھاور کر دیتے ہیں۔ اس کہانی میں بھی کتا بھوکا پیاسا رہ کر اپنے مالک کے گھر کی حفاظت کرتا ہے۔ مالک اپنے بچّوں کے سامنے وفادار جانور کو نظر انداز کر سکتا ہے لیکن وفادار جانور ہر حال میں اپنے مالک کے تئیں وفادار رہتا ہے۔
- تکشی شیو شنکر پلّے کی افسانہ نگاری کی یہ خاص بات ہے کہ کسی معمولی کردار یا غیر اہم صورتِ حال سے بات کی ابتدا کر کے وہ ایسے غیر معمولی اور اہم نتائج اخذ کرتے ہیں کہ پڑھنے والا حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ یہ ان کی مخصوص افسانوی تکنیک ہے۔ ''سیلاب'' افسانے میں بھی 'کتے' پر سارا ارتکاز ان کے اِسی انداز کو واضح کرتا ہے۔
- تکشی کے ہاں وحدتِ تاثر اپنے مثالی رنگ میں موجود ہے۔ واقعات کی تفصیل بتاتے ہوئے وہ کبھی بھی نفسِ مضمون سے دور نہیں جاتے۔ ''سیلاب'' افسانے میں بھی اس خصوصیت کو آپ نے بہ غور دیکھا ہوگا۔

آپ بتائیے

1- یہ افسانہ کس زبان میں لکھا گیا؟
2- تکشی شیو شنکر پلّے کب اور کہاں پیدا ہوئے؟ ان کی دو کتابوں کے نام بتائیے۔
3- مندر کی چھت پر کتنے بچّے تھے؟
4- یہ کہانی کس انسانی کردار کے ذکر سے آگے بڑھتی ہے؟
5- چنن کے ساتھ ناؤ پر کون نہیں جا سکا؟
6- خاموش رات میں کس کی آواز سنائی پڑی؟
7- چنن اور اس کے گھر والے جس سُوراخ سے باہر آئے تھے، اس سے کون اندر چلا گیا؟
8- چوروں کی ناؤ کن چیزوں سے بھری ہوئی تھی؟
9- کتّے کی موت کیسے ہوئی؟
10- کس نے اپنی وفاداری آخر تک نبھائی؟

مختصر گفتگو

1- کہیں بھی قدرتی آفات کے وقت کیسے لوگوں کی زندگی پر بن آتی ہے اور کیوں؟
2- سیلاب میں پانی کہاں کہاں سے آ کر نقصان پہنچاتا ہے؟
3- سیلاب میں چنن کے گھر کا حال کیسا تھا؟
4- کتّے کے کس فعل سے آپ متاثر ہوئے؟

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

5- کتے کا مالک اسے کیوں نہیں پہچان سکا؟
6- اس افسانے کا عنوان ''سیلاب'' مناسب ہے؟ اس افسانے کے لیے کوئی نیا عنوان تلاش کیجیے۔
7- سیلاب میں چوروں کی سرگرمی کیوں بڑھی ہوئی تھی؟
8- سیلاب سے بچنے کے لیے اس افسانے میں کون کون سی ترکیبیں کام میں لائی گئی ہیں؟

تفصیلی گفتگو

1- اس افسانے میں کن وجوہات کی بنا پر کتا مرکزی کردار بن گیا؟
2- رات کی خاموشی میں سیلاب کی صورتِ حال کا منظر لکھیے۔
3- اس افسانے میں کن کن جانوروں کا ذکر ہوا ہے؟ لکھیے۔
4- مصنف نے کتے کو مرکزی کردار کیوں بنایا ہے؟
5- کتے کی جگہ کوئی دوسری شے اگر تگشی کی اس کہانی کے مرکز میں ہوتی تو شاید درد و کرب اور وفاداری و جاں نثاری کی وہ فضا قائم نہیں ہو پاتی جو اس افسانے کا جزوِ خاص ہے؟'' درج بالا قول کے اثبات یا نفی میں اپنے خیالات قلم بند کریں۔

آیئے، کچھ کریں

1- اپنے علاقے میں آنے والے سیلاب کے اثرات کا بہ غور جائزہ لیں اور انھیں لکھ کر اپنے استاد کو دکھائیں؟
2- کیا آپ کے علاقے میں سیلاب سے متاثر مقام پر امدادی کیمپ لگتا ہے؟ اگر ہاں تو وہ لوگ کون سے کام کرتے ہیں؟ کاپی پر لکھ کر بتایئے۔
3- آپ سیلاب زدگان کی مدد کس طرح کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں، اس کی تفصیل تیار کیجیے۔
4- سیلاب کے اسباب کے بارے میں اپنے جغرافیہ کے استاد سے معلومات حاصل کیجیے۔
5- کیا آپ کے اسکول کی لائبریری میں جنوبی ہندستان کی کسی زبان کے ادیب کی مترجمہ کتاب موجود ہے؟ اُسے حاصل کر کے پڑھیے اور اپنے تاثرات لکھ کر استاد کو دکھایئے۔
6- کیا آپ نے سیلاب کا منظر کبھی ٹیلی ویژن پر دیکھا ہے؟ اخباروں میں اس سے متعلق خبریں پڑھی ہیں؟ آپ ان وجوہات کی تلاش کیجیے جن سے صوبۂ بہار سیلاب کی زد میں آتا ہے۔ اس سے نجات اور بچاؤ کی جو صورتیں ہو سکتی ہیں، انھیں اپنی کاپی میں درج کیجیے۔
7- اس افسانے میں سیلاب کا جو منظر مصنف نے قلم بند کیا ہے، اُسے نیوز رپورٹ کی شکل میں تبدیل کیجیے۔

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

مضمون

عام طور سے کسی خاص موضوع پر جو تحریر قلم بند کی جائے، اسے ادبی اصطلاح میں مضمون کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس کے لیے Essay لفظ مخصوص ہے۔ انگریزی ہو یا اردو، اس ایک لفظ کے دائرۂ کار میں گاے پر لکھے نوشتے سے لے کر کسی عالمانہ موضوع کا احاطہ کرنے والی تحریر تک کو شامل کیا جاتا ہے۔

غیر افسانوی ادب سے تعلق رکھنے والی یہ صنف اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے مرکزیت کی حامل رہی ہے۔ بالعموم مضمون نگار سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ کسی موضوع کے تئیں معروضی رویہ اختیار کرے اور اس کا نقطۂ نظر عالمانہ ہو۔ مضمون کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ لکھنے والا اپنی باتوں کو سلسلے وار طریقے سے بیان کرے اور وہ اپنے موضوع کے تمام پہلوؤں پر قادر ہو۔

مضمون کی متعدد اقسام ہیں اور اکثر موضوع یا اندازِ تحریر کی وجہ سے انھیں الگ سے پہچانا جاتا ہے۔ جس تحریر میں شعر و ادب کی تفہیم اور تعبیر و تشریح کی کوشش ہوگی، اسے تنقیدی مضمون (Critical Essay) کہا جائے گا۔ جس تحریر میں لکھنے والے کا نقطۂ نظر علمی ہو اور تحریر کا انداز بھی عالمانہ شان کا حامل ہو، اُسے علمی مضمون کہا جائے گا۔ جس مضمون میں لکھنے والا ظریفانہ رُخ اختیار کرے، اسے ظریفانہ مضمون (Light Essay) کہا جائے گا۔ جس تحریر کا انداز ذاتی یا نجی ہو اور بیان کی شگفتگی بھی قائم رہے، اُسے انشائیہ (Personal Essay) کہا جائے گا۔

غیر افسانوی نثر میں مضمون نویسی کی اہمیت اس وجہ سے بھی قائم ہوئی کیوں کہ اس کا دائرۂ کار نہایت وسیع رہا ہے۔ سرسیّد تحریک کے زمانے سے ہی ایسی تحریروں کے لیے ایک موافق ماحول قائم ہوا۔ سرسیّد کے مضامین ان کے زمانے میں مضمون نویسی کے ماڈل کی طرح دیکھے جاتے تھے۔ حالی اور شبلی سے لے کر مہدی افادی تک ہر ادیب نے ایسے مضامین لکھے۔ ظرافت نگاروں نے ظریفانہ مضامین کا ایک طویل سلسلہ قائم کیا۔ صحافتی اور دیگر کاروباری ضرورتوں سے بھی مضمون نویسی کے فن کو استحکام حاصل ہوا۔ حالات اور ضرورت کے تحت اس صنف کی نئی قسمیں بنتی رہی ہیں۔

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

سیّد حامد

سیّد حامد 7 جنوری 1920ء کو فیض آباد (یو۔پی۔) میں پیدا ہوئے۔ ان کے پردادا سیّد محب علی، نیورہ، عظیم آباد کے رہنے والے ڈپٹی کلکٹر تھے جو 1857ء کے قریب مراد آباد (یو۔پی۔) میں آکر بس گئے۔ سیّد حامد کے والد کا نام سیّد محمد صدیق اور والدہ کا محترمہ ستارہ شاہ جہاں بیگم تھا۔ ان کا خاندان اعلا تعلیم یافتہ تھا۔

سیّد حامد کی ابتدائی تعلیم اُناؤ میں ہوئی۔ 1930ء میں ان کا داخلہ گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج، مراد آباد میں ہوا جہاں سے 1935ء میں انھوں نے ہائی اسکول کا امتحان اوّل درجے میں پاس کیا اور اسکالرشپ کے مستحق قرار پائے۔ 1937ء میں بی۔اے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے، 1941ء میں انگریزی میں ایم۔اے۔ اور 1947ء میں فارسی سے ایم۔اے۔ کے امتحانات پاس کیے۔ 1943ء میں اسٹیٹ سول سروس کے لیے ان کا انتخاب ہوا۔

25/دسمبر 1950ء کو سیّد حامد کی شادی مشہور انشا پرداز مہدی افادی کی پوتی ثریا حسن بنت احمد حسن سے ہوئی۔ 1951ء میں آئی۔اے۔ایس۔ کے لیے انتخاب ہوا اور مرکزی حکومت کی وزارتِ صنعت وتجارت میں ڈپٹی سکریٹری اور جوائنٹ سکریٹری رہے۔ اس کے علاوہ وہ الٰہ آباد میونسپل کارپوریشن میں ایڈمنسٹریٹر، ہاؤسنگ کمشنر، جوائنٹ سکریٹری، پلاننگ کمیشن، وزارت مواصلات میں ایڈیشنل سکریٹری رہے۔ وہ اسٹاف سلیکشن کمیشن کے بانی اور چیرمین بھی رہے۔ جون 1980ء میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بنائے گئے اور مارچ 1985ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ 1983ء میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ 1986ء سے 1991ء تک انجمن ترقی اردو کے صدر رہے۔ ان دنوں جامعہ ہمدرد کے چانسلر ہیں۔

سیّد حامد کی تعلیمی زندگی بہت شاندار رہی۔ تعلیم کے علاوہ کھیل کی دنیا میں بھی امتیاز حاصل کیا۔ ہاکی اور ٹینس کے کھیل میں برابر حصہ لیتے رہے۔ سیّد حامد کی ادبی زندگی بھی بے حد فعّال رہی۔ شاعری اور ترجمے کے علاوہ انھوں نے کثیر تعداد میں مضامین لکھے۔ یہ مضامین نہ صرف زبان وبیان بلکہ فکر وخیال کے اعتبار سے بھی بڑے بیش قیمت ہیں۔ اردو میں ان کی کچھ اہم تصانیف ہیں ——— 1- آزمایش کی گھڑی 2- قلم اور قدم 3- قوس قزح (ترتیب) 4- کربِ آگہی 5- لمعات (شعری مجموعہ) 6- مہر وماہ (ترجمہ) 7- نگار خانۂ رقصاں (تنقیدی مضامین) 8- مضامینِ سیّد حامد (دو جلدوں میں)

سیّد حامد

علمی مضمون

شَے لطیف

بچپن میں سنا تھا "فلاں صاحب میں شَے لطیف کی کمی ہے"۔ ذہن میں یہ تاثر تھا کہ یہ جملہ ایسے شخص کے لیے کہا جاتا ہے جس میں بھونڈا پن پایا جائے۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ "شَے لطیف" سے نہ فکر کی لطافت مراد ہے، نہ اطوار کی نفاست۔ شَے لطیف دراصل تناسب کے احساس کا دوسرا نام ہے۔ کوئی بات کہاں کہنی چاہیے، کس طور پر کہنی چاہیے، اس کا صحیح فیصلہ انسان شَے لطیف کی رہنمائی کے بغیر نہیں کر سکتا۔

آپ کی نظر سے ایسے لوگ گزرے ہوں گے جنھیں اپنی قسمت سے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ وہ سدا سچی اور کھری بات کہتے ہیں؛ پھر بھی کوئی اُن کی بات نہیں سنتا۔ لوگ اُلٹے ان کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ جہاں انھوں نے یہ بات شروع کی، لوگوں نے تیوری چڑھائی کہ دیکھیے اب کیا آتا ہے۔ بجائے اُن کی سچائی کی تعریف اور پذیرائی کرنے کے، لوگ ان کی باتوں سے مکدّر ہونے لگتے ہیں اور بعض تو دشمنی پر اُتارو ہو جاتے ہیں۔ یہ بے محل بولنے والے سوچتے بھی نہیں کہ بات موقع دیکھ کر کرنی چاہیے۔ بے موقع بات جراحت کا سامان بہم پہنچاتی ہے یا استہزا کا۔ جو لوگ سچ بات کہہ کر بغیر ارادۂ اصلاح کے، دوسروں کا دل دُکھاتے ہیں، وہ سچائی کو بدنام کرتے ہیں اور بہتوں کو سچائی سے بدگمان کر دیتے ہیں۔ بات شروع کرتے وقت یہ تو سوچ ہی لینا چاہیے کہ اس بات کا اثر کیا ہوگا؟ اگر بات کا اثر بُرا ہونے کا ڈر ہے تو بات کی ہی کیوں جائے؟ کیا صرف اس وجہ سے کہ وہ زبان پر آ گئی ہے یا اس بنا پر کہ حقیقت بے نقاب ہونے کے لیے بے تاب ہے۔ کسی شخص نے کوئی غلط قدم اٹھایا اور آپ نے اسے برملا بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا تو کیا نتیجہ ہوگا؟ وہ ضد پکڑ جائے گا اور اپنے دل میں آپ کے لیے کدورت یا عداوت کو جگہ دے دے گا۔ آپ چلے تھے اصلاح کرنے، اس کے بجائے آپ نے مخاطب کو، اس کی غلطی کو، اس کی غلطی میں راسخ کر دیا اور اسے اپنا دشمن بھی بنا لیا۔

آپ کسی سے ملنے گئے۔ اس کے اختیار میں ہے کہ آپ کا کام بن جائے۔ لیکن آپ سوال کے بجائے چھوٹتے ہی مطالبہ کرنے لگے، حکم دینے لگے، جھگڑنے لگے تو اس کا اختیار تمیزی جو آپ کے مسئلے کو حل کرنے میں صرف ہوتا ہے، اسے اُلجھانے میں لگا دیا جائے گا۔ بات کرنے کا ڈھنگ زندگی کی اہم ترین چیزوں اور کامیابی کے اہم ترین وسائل میں سے ہے۔ اگر ڈھنگ مناسب ہے تو بات بن جائے گی؛ ناروا ہے تو بات بگڑ کر رہے گی۔

کس وقت بات کرنی چاہیے اور کس وقت دم سادھ لینا چاہیے، اس کا فیصلہ ہمیں روز کرنا پڑتا ہے۔ صحیح فیصلہ احساسِ تناسب کے بغیر ممکن نہیں۔ آپ کو اپنے افسر سے شکایت ہے؛ آپ اس کا ذکر جا بہ جا کرتے پھرتے ہیں۔ گویا شکایات کے دو چند ہو جانے کا بہ نفسِ نفیس انتظام کر رہے ہیں۔ یاد رکھیے، آپ کے کلمات موصوف تک پہنچ جائیں گے،

''مناسب''، یعنی نامناسب اضافوں کے ساتھ۔ اس سے بہتر ہوتا کہ آپ موصوف سے خود بات کر لیتے اور بات کرتے ہوئے اس احساس کا اظہار کر دیتے کہ انھیں آپ کی خوش حالی اور آپ کے مستقبل میں دل چسپی ہے اور اس امید کو زبان دیتے کہ آپ کو ان کی ہمدردی پر اعتماد ہے۔ یاد رکھیے کہ ہر انسان ان توقعات کو جو دوسروں کو اس کے متعلق ہیں، پورا کرنے کی کچھ نہ کچھ کوشش ضرور کرتا ہے۔ جس مسئلے میں آپ نے کسی دوسرے کو ابتدا ہی سے شریک کر لیا، وہ مسئلہ آپ کی طرح خود اس کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ بات یہاں بھی نہیں رُکتی۔ ماہرینِ نفسیات کہتے ہیں کہ ہر فرد ان توقعات کو بھی جو خود اُسے اپنی ذات سے ہیں، پورا کرتا ہے یا اس دشا میں آگے بڑھتا ہے۔ جبھی تو کہتے ہیں کہ اپنے پیشے کو شکستوں کی یاد یا ہار کے تصور سے گرد آلود نہ کرو۔ ناکامیوں اور نااہلیوں کو بھول جاؤ اور اپنی کامیابیوں اور کارگزاریوں کو یاد رکھو۔ اس طرح تم اپنے پیشے میں آب و رنگ بھر دو گے جو تمھارے اندر اعتماد اور افتخار پیدا کر کے تم سے بڑے بڑے کام کرالے گی۔ جیسے جیسے نئی کامیابیاں تمھیں حاصل ہوں گی، پرانی ناکامیوں کی یاد خزاں کے پتوں کی طرح جھڑتی چلی جائے گی اور نئی کامیابیاں بہار کی کونپلوں کی طرح حافظے میں پھوٹ کر نکلیں گی۔ تمھارا تصور تمھارے متعلق جو پیکر بنائے گا، اس میں ولولہ، اعتماد، قوت تسخیر جلوہ گر ہوگی۔ ناکامیابیوں اور شکستوں کے اسباب کا جلد ہی تجزیہ کر کے اُن کی حوصلہ شکن یاد کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دو۔

جو لوگ شیخی کے عادی ہیں یا خودستائی سے باز نہیں آتے، وہ بھی انھیں محروموں میں سے ہیں، 'شئے لطیف' جن سے کترا کر نکل گئی۔ مان لیجیے کہ آپ افلاطون ہیں مگر اس شخص کو جس سے آپ بات کر رہے ہیں، آپ کے افلاطون ہونے سے کیا سروکار۔ اُس کے پاس اس یاوہ گوئی کو سننے کے لیے وقت کہاں۔ آپ ڈینگ لیں گے تو شروع میں وہ آپ کی سادگی پر مسکرائے گا لیکن جلد ہی اُکتا جائے گا اور آپ کی صحبت سے گریز کرنے لگے گا۔ آپ اگر واقعی افلاطون ہیں تو آپ کو خود اس کا اعلان کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ کی دانش مندی سورج کی کرنوں کی طرح دنیا میں پھیل جائے گی۔

ایک گروہ اُن اشخاص کا ہے جو اپنی تعریف تو نہیں کرتے لیکن اپنا اور اپنے گھر والوں کا ذکر کرتے ہوئے نہیں تھکتے۔ یہ خیال ان کے دماغ پر اپنا سایہ نہیں ڈال پاتا کہ آپ کے گھرانے کے متعلق دوسروں کو دل چسپی کیوں ہونے لگی اور ان لوگوں کی تو سماج میں کمی نہیں جو آپ کے پاس آ کر گھنٹوں بیٹھ جائیں گے اور باتیں کیے جائیں گے یا خاموش بیٹھے رہیں گے۔ دونوں صورتوں میں انھوں نے آپ کا وقت خراب کیا؛ آپ کے سکونِ خاطر کو برہم کیا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اپنی صحبت کا شرف بخش کر وہ آپ پر احسان کر رہے ہیں۔ حالاں کہ دراصل انھوں نے آپ کو عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ ایسے لوگوں کو انگریزی میں ''بور'' کہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ''شئے لطیف'' کا انتساب ناممکن ہے۔

اور ایسے لوگ بھی ہمیں اپنے اردگرد مل جائیں گے جو شیخی مارنے کے بجائے اس کے برعکس عمل کرتے ہیں۔ یعنی اپنی کم مایگی اور نااہلی کا وقت ناوقت اعلان کرتے ہیں۔ انھیں کھرچ کر دیکھیے تو پتا چلے گا کہ اپنی ذاتِ گرامی کے متعلق انھیں دل ہی دل میں ہزاروں خوش فہمیاں ہیں اور یہ خوش فہمیوں کی طغیانی ہے جو انکسار کا بہروپ بھر کر زبان پر آتی ہے۔ گویا اپنے افتخارِ ذاتی کو اس عنوان برہنہ ہونے سے بچایا جا رہا ہے۔ بعض مبصرین اس انکسار میں دعوتِ ستائش کو کروٹ لیتے ہوئے

دیکھتے ہیں۔ موصوف کے پاس صرف ایک صورت ستایش حاصل کرنے کی ہے، اپنے آپ کو بُرا بھلا کہنا، نیچا دکھانا، ذرّہ ناچیز بتانا۔ مخاطب کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا کہ موصوف جو کچھ کہہ رہے ہیں، اس کی تردید کرے اور ان کی تعریف کے پُل باندھے تاکہ محترم کی تفریط اور اس کی افراط سے ایک اوسط نکل آئے جو حقیقت کے قریب تر ہو یا کم از کم مخاطب پر یہ الزام نہ آئے کہ محترم اپنی جو ہجو کر رہے ہیں، وہ اس میں برابر کا شریک ہے۔ بہر حال یہ انکسار جھوٹا انکسار ہے، پُر فریب انکسار ہے اور اس کا شمار خصائل حمیدہ میں کرنا فریب کھانے والوں کے لیے بھی دشوار ہے۔ جھوٹے انکسار سے پُر خلوص ڈینگ بہتر ہے۔ 'شے لطیف' کا پہرہ جہاں ہٹا، اس طرح کے نفسیاتی آسیب دل و دماغ میں داخل ہو جاتے ہیں اور زبان کے میدان میں آ کر دادِ شجاعت دیتے ہیں۔

یوں تو "شے لطیف" کی کمی اپنے اظہار کے لیے زبان کی محتاج بھی نہیں۔ اس کے ناگفتہ کرشمے بھی کوئی کم نہیں۔ بے محل اور بے موقع کام بھی لوگ ناحق کر گزرتے ہیں۔ جو بات کسی موقعے پر نہ کہنی چاہیے، جو کام کسی موقعے پر نہیں کرنا چاہیے، وہی کرتے ہیں اور سب کو خفت، پشیمانی اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا کرتے ہیں۔

زندگی کا تجربہ جتنا وسیع ہوتا ہے اور انسانوں کے باہمی تعلقات اور ان کے ردِّ عمل کے تجزیے کا موقع جس قدر ملتا ہے، اسی قدر یہ بات کھلتی جاتی ہے کہ انسان کے لیے تناسب کا احساس بے حد ضروری وصف ہے۔ اگر یہ نہ ہوگا تو وہ ہر قدم پر ٹھوکریں کھائے گا اور زندگی کے صحرا میں بھٹکتا رہ جائے گا۔ یہ دنیا اتنی وسیع، یہ زندگی اتنی پیچیدہ، یہ تجربات اتنے گوناگوں اور حالات کی صورتیں باہم دگر، اس قدر مختلف اور باہمی روابط اتنے نازک اور افراد کی انا اس قدر استیلا طلب اور مختارات اتنے وافر، راہیں اتنی کثیر اور کسی ایک لمحے میں کچھ کہنے یا کرنے کے امکانات اس قدر مجموع ہوتے ہیں کہ تناسب کا احساس اگر رہنمائی اور یاوری نہ کرے تو فرد ٹکرا ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے، بھٹکتا رہے اور جیوں جیوں آگے بڑھے، منزل سے دور ہوتا چلا جائے۔ اس قدر دوڑ کہ مرکز کی طرف واپس آنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔ مرکز سے دور ہونے کا انجام کیا ہے، پارہ پارہ ہو جانا، بکھر جانا۔ یہی انجام اس شخصیت کا ہوتا ہے۔ احساسِ تناسب جس کی شیرازہ بندی نہیں کرتا، وہ شخصیت منقسم (Split Personality) شخصیت کی سرحد پر منڈلانے لگتی ہے۔

یہ احساسِ تناسب ہی ہے جو بات کی تہہ تک پہنچاتا ہے۔ ورنہ انسان کے حواسِ خمسہ دماغ کی طرف ہزاروں، لاکھوں تاثرات اور پیغامات بھیجتے رہتے ہیں۔ غریب دماغ ان کے ہجوم سے گھبرا جائے اور اس طرح ہاتھ پانو مارنے لگے جیسے ڈوبتا ہوا انسان موجوں کی یورش میں دیوانہ وار ہاتھ پانو مارتا ہے۔ یہ احساسِ تناسب ہے جو اُن ہزارہا پیغامات میں سے جو حواس دماغ کو بھیجتے ہیں، چند کی طرف دھیان دیتا ہے اور باقی کو تحت الشعور کے گودام میں بھر دیتا ہے۔ اہم اور غیر اہم کا امتیاز، ضروری اور غیر ضروری کی تفریق بلکہ نیک و بد اور حسن و قبح کی تمیز تک بھی احساسِ تناسب یا شے لطیف کی قلم رَو میں آجاتی ہے۔ اسی وصف کا تیسرا نام قوتِ انتخاب ہے۔

طالب علموں کے لیے احساسِ تناسب کو آزمانے اور اس پر سان رکھنے کا ایک موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ امتحان

میں ایک طویل عبارت دے دی گئی اور کہا گیا کہ اس کا خلاصہ (Precis/Synopsis) لکھو، اس کا لبّ لباب بتاؤ۔ جواب سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ امتحان دینے والے میں تناسب کا احساس کس حد تک ہے۔ کس پایے کا ہے۔

زندگی میں ہر قدم پر فیصلے کرنا پڑتے ہیں۔ یعنی کئی راہوں، کئی مختارات میں سے ایک کو چننا پڑتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فیصلہ کرنے کے لیے ایک ثانیہ سے زیادہ سمے نہیں ملتا۔ زندگی کے امتحان میں جو پرچہ آپ کو آئے دن بلکہ متواتر کرنا پڑتا ہے، وہ سیکڑوں کثیر الانتخاب (Objective Question of Multiple Choice Type) معروضی سوالات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر آپ کو قدرت نے "شٔے لطیف" سے نوازا ہے، اگر آپ کو احساسِ تناسب کی دولت ملی ہے تو آپ زندگی کے اس امتحان میں پورے اتریں گے ورنہ اس بحرِ ذخّار میں بے سمت و ارادہ غوطے کھاتے رہیں گے۔ 'شٔے لطیف' بالکل نہ ہو تو مرض لاعلاج ہے! تھوڑی بہت ہو تو اس کو بڑھایا اور سنوارا جا سکتا ہے۔ جس طرح طالب علم مشق کے بعد لبّ لباب یا خلاصہ بہتر لکھنے لگتا ہے اسی طرح انسان محنت اور ممارست کے ذریعہ اپنے شٔے لطیف اور احساسِ تناسب کی گیرائی اور گہرائی کو فروغ دے سکتا ہے۔ شٔے لطیف کی کمی جہاں دوسروں کے لیے حظ کا سامان فراہم کرتی ہے وہاں محرومین کے لیے ناکامیوں کی ضمانت لے لیتی ہے۔ شٔے لطیف کی کمی ہو تو انسان پر غلط بات کرنے اور صحیح بات غلط وقت پر یا غلط ڈھنگ سے کرنے اور غلط فیصلہ کرنے اور غلط قدم اٹھانے کا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

شٔے لطیف، احساسِ تناسب، صلاحیتِ انتخاب، قوتِ فیصلہ، قوتِ ممیّزہ ایک ہی وصف کی مختلف شکلیں ہیں۔ ان میں سے ایک کو مانجھیے تو باقی سب پر جلا آتی ہے۔ ایک کو غذا دیجیے تو باقی سب کو توانائی ملتی ہے۔ ایک کی مشق کیجیے تو یہ ہم رشتہ قوتیں بھی چمک جاتی ہیں۔ شٔے لطیف کو نازک نہ سمجھیے۔ اس میں بہت جان ہے۔ اسے نہر جانیے، یہ اسی سرچشمے سے نکلی ہے جہاں سے بڑی بڑی ندیاں پھوٹی ہیں جو انسان کو سیراب کرتی ہیں، اسے تناور درخت بناتی ہیں۔ اس کی شخصیت کو پروان چڑھاتی ہیں اور احتسابات کے قصر کے لیے امکانات کے دروازے کھول دیتی ہیں۔ باقاعدگی، ترتیب، انضباط یہ سب اسی بنیادی وصف کی دین ہیں۔ بظاہر چھوٹی سی یہ صفت کتابِ زندگی کی شیرازہ بند ہے۔ شٔے لطیف اعتدال کے راستے پر چلاتی ہے۔ جو لوگ اعتدال سے عادتاً تجاوز کرتے ہیں انھیں شٔے لطیف سے کوئی سروکار نہیں۔ شٔے لطیف سلیقے کا سبق دیتی ہے۔ قرینہ سکھاتی ہے۔ سلامت روی کی چال چلواتی ہے۔ زندگی کے بحری سفر میں اس کی حیثیت قطب نما کی ہے۔

لفظ و معنی

شٔے لطیف	-	باریک چیز، نازک چیز
لطافت	-	عمدگی، نرمی، پاکیزگی
نفاست	-	عمدگی، خوبی، صفائی
مکدّر	-	گدلا، میلا، ناراض
جراحت	-	گھاؤ، زخم

استہزا - ہنسی، مذاق

برملا - سب کے سامنے کھلم کھلا

کدورت - دل کا میل، کینہ

راسخ - مضبوط، پختہ

بہ نفسِ نفیس آنا - خود سے چل کر آنا

موصوف - وصف کیا ہوا، ممدوح، وہ جس کی توصیف/تعریف کی جائے

گرد آلود - گرد، دھول سے بھرا ہوا

افتخار - فخر، عزت، گھمنڈ

پیکر - شکل وصورت، چہرہ، جسم

قوتِ تسخیر - جیت لینے کا ہنر، طاقت

جلوہ گر - جلوہ دکھانے والا

حوصلہ شکن - ہمت توڑنے والا

خودستائی - اپنی تعریف آپ کرنا

دانش مندی - عقل مندی، دانائی

طغیانی - اُٹھان

انکسار - عاجزی، کمتری، عجز

ذرۂ ناچیز - معمولی آدمی، کسرِ نفسی یا انکسار کے اظہار کے طور پر خود اپنی ذات کے لیے بولا جاتا ہے۔

خصائلِ حمیدہ - اچھی عادتیں

دادِ شجاعت - بہادری، دلیری

دادِ شجاعت دینا - جنگ میں دلیری سے لڑنا

خِفت - شرمندگی، ندامت

پشیمانی - افسوس، ندامت

استیلا - غلبہ، تسلط

مختار - مالک، اختیار والا، صاحبِ اختیار

وافر - زیادہ، کثیر، کثرت سے

یاوری - مدد، حمایت، دست گیری

شیرازہ بندی - جلد بندی، یکجائی

حواسِ خمسہ	-	پانچ حواس جو قدرت نے ہمیں عطا کیے ہیں: سونگھنے، دیکھنے، سننے، چکھنے، اور چھو کر محسوس کرنے کی صلاحیتیں
یورش	-	حملہ، دھاوا، چڑھائی، یلغار
شعور	-	سمجھ، عقل، تمیز
تحت الشعور	-	شعور سے نیچے، یادداشت کا وسطی درجہ؛ جو باتیں شعور کی سطح پر ہوتی ہیں، وہ ذہن میں حاضر ہیں، جو شعور سے نیچے چلی گئیں، وہ گویا بھولی بسری ہوئیں اور جو یاد کرنے یا یاد دلانے سے پھر شعور کی سطح پر آسکتی ہیں، اس سے نیچے لاشعور کی دنیا ہے جہاں دفن ہوئی یادوں یا باتوں کو واپس شعور کی سطح پر لانا انسان کے اختیار سے باہر ہے
امتیاز	-	فرق، تمیز، شناخت
قبح	-	بُرائی، عیب، نقص
لُبِ لباب	-	خلاصے کا خلاصہ، اصل مطلب، مغزِ کلام
کثیر الاختیارات	-	بہت اختیار والا
بحرِ زخّار	-	بہت بڑا سمندر یا مہاساگر
مُمارست	-	تجربہ، مشق
حظ	-	مزہ، لطف، لذّت
محرومین	-	محروم لوگ، جنھیں کچھ حاصل نہ ہوا ہو
قوتِ مُمیّزہ	-	بھلے بُرے کو پہچاننے والی قوت، تمیز کی صلاحیت
تناور درخت	-	گھنا پیڑ، بڑا درخت
اکتساب	-	ذاتی محنت سے حاصل کرنا
قصر	-	محل، ایوان
انضباط	-	پختگی، مضبوطی
شیرازہ بند	-	یکجا جمع، جتھ بندی
تجاوز	-	حد پار کرنا، حد سے بڑھنا، بے راہ ہو جانا
قرینہ	-	سلیقہ، ڈھنگ

آپ نے پڑھا

❑ انسان کے اندر ہزار پوشیدہ صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ انھی میں سے چند کو وہ اُجاگر کر کے زندگی میں

کامیاب وکامران ہوسکتا ہے۔ اس کی پوشیدہ صلاحیتوں میں ایک بڑی صلاحیت کا تعلق تناسب کے احساس سے ہے۔ ہر کام سے پہلے اُسے معلوم ہو کہ یہ کام کا صحیح وقت ہے۔ کب کیا بولنا ہے، کتنا بولنا ہے اور کیا نہیں بولنا ہے، کب خاموش رہنا ہے اور کہاں چیخنا ہے، اس کے لیے موزوں وقت اور حالات کی سمجھ اگر آدمی میں نہ ہو تو اس کی ساری خوبیاں بے کار ہو جاتی ہیں اور اکثر وہ آدمی تماشا بن کر رہ جاتا ہے۔

- سیّد حامد نے کسی شخص کے اندر اسی احساسِ تناسب، وقت اور حالات کی شناخت کو "شے لطیف" کہا ہے جس کی کمی کے سبب ہونے والی ناکامیوں کی مثالیں انھوں نے روزمرّہ کی زندگی کے دیکھے بھالے کرداروں اور واقعات سے فراہم کی ہیں۔
- مضمون نگار نے یہ واضح کیا ہے کہ دوسروں کی شکایت کرنے والے، اپنی اور اپنے گھر کی تعریف کرنے والے، اپنی نااہلی کے ذکر کے پردے میں دراصل اپنی ستائش چاہنے والے، بے موقع اور بے ڈھنگے انداز سے بات کہہ کر جھنجھلاہٹ اور پریشانی میں ڈالنے والے، اس نوع کے اشخاص ناکام ہو کر زندگی کے صحرا میں بھٹکتے رہ جاتے ہیں اور ان کی شخصیتیں پارہ پارہ اور منقسم ہو کر رہ جاتی ہیں۔
- سیّد حامد کی نثر منطقی، واضح اور شگفتہ ہے۔ اپنی بات متین، نرم اور سنجیدہ انداز میں پیش کرتے ہوئے اُن کا طرزِ استدلال معروضی ہوتا ہے۔ وہ دلیلوں اور سامنے کی مثالوں کا خوب خوب استعمال کرتے ہیں۔ اُن کی دلیلوں اور مثالوں سے اُن کے وسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے کا پتا چلتا ہے۔
- "شے لطیف" کی تعریف، اس کی قسمیں اور صورتیں، انفرادی و اجتماعی طور پر اُس کے نتائج نیز اس کے مثبت اور مفید پہلوؤں پر لکھے گئے اس مضمون کا مقصد اصلاحی ہے۔ اسی کی کمی یا اس کے نہیں ہونے کے نتیجے میں انسانی شخصیت ادھوری ہو جاتی ہے اور انسان قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہوا ناکام ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور شے 'بدگمانی' بھی ہے۔ اس کے تماشوں اور نتیجوں کا بیان اسی عنوان سے مولانا الطاف حسین حالی نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ سیّد حامد کی یہ تحریر حالی کے مضمون کے اصلاحی طرزِ فکر اور دردمندی سے پُر اندازِ بیان سے قریب ہے۔ اس لیے اسے حالی کی روایت کی ایک قابلِ قدر توسیع قرار دیا جا سکتا ہے۔

آپ بتائیے

1- سیّد حامد کہاں پیدا ہوئے؟
2- اُن کی ایک تصنیف کا نام بتائیے؟
3- کیا وہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بھی تھے؟
4- "ناکامیوں اور نااہلیوں کو بھول جاؤ اور اپنی کامیابیوں اور کارگزاریوں کو یاد رکھو۔" یہ بات کس نے کہی ہے؟
5- 'شے لطیف' میں "سحر ذخار" کس کو کہا گیا ہے؟
6- سیّد حامد کیا کبھی انجمن ترقی اردو کے صدر بھی ہوئے؟

مختصر گفتگو

1- "شے لطیف" کی تعریف کیجیے اور اس کی دو مثالیں دیجیے۔
2- سیّد حامد کی نثر کی دو خوبیوں کو "شےِ لطیف" کی روشنی میں واضح کیجیے؟
3- سیّد حامد نے شے لطیف کو چھوٹی سی نہر کیوں قرار دیا؟
4- کامیاب لوگ "شے لطیف" سے کیا کام لیتے ہیں؟
5- زندگی کے صحرا میں انسان کیوں بھٹکتا رہ جاتا ہے؟

تفصیلی گفتگو

1- "شےِ لطیف" کی روشنی میں سیّد حامد کے اندازِ فکر پر روشنی ڈالیے۔
2- کسی شخص میں "شے لطیف" کے ہونے سے کیا کیا خوبیاں پیدا ہوتی ہیں؟ بتائیے۔
3- "شےِ لطیف" ایک وصف ہے اور اس کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ ان شکلوں کی نشان دہی کرتے ہوئے ان میں سے کسی ایک پر اظہارِ خیال کیجیے۔
4- ایک مضمون لکھیے جس میں سیّد حامد کی تعلیمی اور ادبی خدمات کا احاطہ ہو۔
5- سیّد حامد کی زبان اور اسلوب کے بارے میں لکھیے۔
6- سچّی اور کھری بات کہنے والے لوگوں کے ساتھ سماج کا کیا رویہ رہتا ہے؟

آیئے، کچھ کریں

1- سیّد حامد کی تصانیف کی فہرست بنا کر اُن میں جو آپ کو پسند ہو، اُسے لائبریری سے نکال کر پڑھیے اور اس کے اہم نکات کے بارے میں اپنے استاد اور دوستوں سے گفتگو کیجیے۔
2- "شےِ لطیف" میں جو باتیں آپ کو پسند آتی ہیں، ان پر عمل کیجیے اور اپنے آس پاس کے لوگوں کو بتائیے۔ اپنے ساتھیوں سے اس پر گفتگو کرتے ہوئے سارے مشاہدات اپنی کاپی پر لکھ کر استاد کو دکھائیے۔

ناول

دنیا میں ناول کو صنعتی عہد کے فروغ کے ساتھ جوڑ کر دیکھا جاتا ہے۔ سترہویں صدی کے بعد کی دنیا میں جگہ جگہ ناول نگاری کی ابتدائی کوششیں دکھائی دینے لگی تھیں۔ جرمنی، برطانیہ، فرانس اور روس میں ناول نگاروں کا ایک ایسا سلسلہ سامنے آیا جس سے تھوڑے وقفے میں ہی اس صنف کو اعتبار حاصل ہوگیا۔ 1869ء میں ڈپٹی نذیر احمد نے ''مراۃ العروس'' نام سے قصے کی ایک ایسی کتاب لکھی جسے بعد کے زمانے میں اردو کا پہلا ناول قرار دیا گیا۔ نذیر احمد نے مزید چھے ناول رقم کیے۔ تمام کتابوں میں قصہ گوئی کی تان قوم کی زبوں حالی اور اصلاحِ معاشرہ پر ٹوٹتی ہے۔ شاد عظیم آبادی کے نام سے ''صورۃ الخیال'' شائع ہوا۔ حالی کا ناول ''مجالس النسا'' اور رشیدۃ النسا کا ناول ''اصلاح النسا'' تو پورے طور پر نذیر احمد کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اسی زمانے میں عبدالحلیم شرر اور پنڈت رتن ناتھ سرشار نے ناول نگاری کا قدرے مختلف نگار خانہ سجایا۔ شرر تاریخ کے پردے میں اپنی باتیں کہتے ہیں اور سرشار تہذیب و ثقافت اور قدروں کو بنیاد بناتے ہیں۔ اودھ پنچ کے اڈیٹر منشی سجاد حسین کے ناول ''حاجی بغلول''، ''کایاپلٹ'' اور ''میٹھی چھری'' میں ظرافت کے پردے میں سماجی حقائق کا زبردست اظہار ملتا ہے۔ اسی عہد میں قاری سرفراز حسین عزمی کا ناول ''شاہدِ رعنا'' بھی سامنے آیا۔

1898ء میں ''امراؤ جان ادا'' کی اشاعت سے اردو ناول کا عہدِ جدید شروع ہوتا ہے۔ مرزا ہادی رسوا کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے موضوع، تکنیک اور فکر و فن کے برتاو میں اس توازن کا استعمال کیا جس کی وجہ سے شاہ کار تیار ہوتے ہیں۔ ناول کے فن اور تکنیک کے اعتبار سے مرزا رسوا نے جس عہدِ جدید کا خاکا کھینچا، اس کا نقطۂ عروج پریم چند کے ناولوں میں سامنے آتا ہے۔ ''اسرارِ معبد'' سے ''منگل سوتر'' تک پریم چند کے پندرہ ناول ہیں۔ اس تعداد میں ''گئودان'' اور ''میدانِ عمل'' جیسے شہکار بھی شامل ہیں۔ پریم چند کو ہندستان کی قومی تحریک کا وہ پس منظر ملا جس کے سہارے انھوں نے اپنے ناولوں کو اپنے عہد کا نبض پیما بنایا۔ پریم چند کے بعد اور ترقی پسند ناول نگاروں کے بیچ رومانیت کے لہجے کی بازیافت کا دور ہے۔ قاضی عبدالغفار اور مجنوں گورکھ پوری اردو کے دو اہم رومانی ناول نگار ہیں۔

ترقی پسند ناول نگاروں میں سب سے پہلے سجاد ظہیر کا واحد ناول ''لندن کی ایک رات'' 1938ء میں شائع ہوا۔ شعور کی رو کی تکنیک کا تعارف اردو میں پہلی بار سجاد ظہیر نے اس ناول کے ذریعے کرایا۔ کرشن چندر اور عصمت چغتائی ترقی پسندوں میں خاصے مقبول ناول نگار ہیں۔ ''شکست'' کرشن چندر کا سب سے اہم ناول تسلیم کیا جاتا ہے جس میں فنی

اور ترقی پسندانہ فکر دونوں کا توازن ملتا ہے۔ عصمت چغتائی نے ''ضدی'' ناولٹ سے ابتدا کی لیکن ''ٹیڑھی لکیر'' کی اشاعت نے انھیں اردو کے بڑے ناول نگاروں کی صف میں شامل کیا۔ 1947ء کے آس پاس بڑی تعداد میں ایسے ناول لکھے گئے جن میں ہندستان کی قومی تحریک سے ابھرنے والے مسائل اور تقسیم ملک کے اثرات زیر بحث آئے تھے۔

1959ء میں قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' کی اشاعت کے ساتھ جو سلسلہ شروع ہوا، وہ پندرہ برسوں تک جاری رہا۔ اُداس نسلیں (عبداللہ حسین)، خدا کی بستی (شوکت صدیقی)، علی پور کا ایلی (ممتاز مفتی)، آنگن (خدیجہ مستور)، تلاشِ بہاراں (جمیلہ ہاشمی)، لہو کے پھول (حیات اللہ انصاری)، ایک چادر میلی سی (راجندر سنگھ بیدی)، بہت دیر کردی (علیم مسرور) اردو ناول کی تاریخ میں اہم ہیں۔ 1988ء میں ''دوگز زمین'' (عبدالصمد)، 1989ء میں ''پانی'' (غضنفر) اور ''مکان'' (پیغام آفاقی) کی اشاعت کے ساتھ پھر سے اردو میں ناول نگاری کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ہم عصر ناول نگاروں میں غضنفر نے سب سے زیادہ ناول لکھے۔ پندرہ برسوں میں ان کے سات ناول سامنے آئے۔ زبان کی سطح پر غضنفر کے یہاں اچھی خاصی تجربہ پسندی ہے۔ عبدالصمد کے ناول دوگز زمین، مہاتما، خوابوں کا سویرا، مہاساگر اور دھمک رفتہ رفتہ انھیں ناول نگار کے طور پر پہچان دلانے میں کامیاب ہوئے۔ مشرف عالم ذوقی نے بھی سرگرمی کے ساتھ ناول لکھے ہیں۔ سیّد محمد اشرف نے 'نمبردار کا نیلا'، انور خاں نے 'یادبسیرے' اور 'پھول جیسے لوگ' لکھ کر اس روایت کو قائم رکھا جس میں اکثر افسانہ نگار ناولوں کی طرف بھی آتے ہیں۔ حسین الحق نے ''بولو مت چپ رہو'' اور ''فرات''، شفق نے ''کانچ کا بازی گر''، ''بادل'' اور ''کابوس''، شموئل احمد نے ''ندی'' اور ''مہاماری'' جیسے ناول لکھے۔ بزرگوں میں اقبال مجید نے 'کسی دن' اور 'نمک' شائع کیے۔ الیاس احمد گدی کا ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ ناول 'فائر ایریا' بھی ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا ہے۔ ابھی حال میں شمس الرحمان فاروقی نے تہذیبی ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں'' شائع کرایا۔

رشیدۃ النسا

رشیدۃ النسا کی ولادت غدر سے چند برس پیش تر 1853ء میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام سیّد وحید الدین تھا جنھیں حکومتِ ہند نے شمس العلما اور خان بہادر کے خطابات عنایت کیے تھے۔ سیّد وحید الدین کی تین شادیاں ہوئیں۔ پہلی بیوی کے بطن سے چار لڑکے اور ایک لڑکی کی پیدایش ہوئی۔ وہی لڑکی رشیدۃ النسا تھیں۔ مولوی امداد امام اثر رشیدۃ النسا کے سوتیلے بھائی تھے۔

رشیدۃ النسا نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمان گھرانوں میں لڑکیوں کا اسکول میں داخلہ نہایت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لڑکیاں گھر میں پڑھتیں بھی تو انھیں لکھنا نہیں سکھایا جاتا تھا۔ رشیدۃ النسا نے گھر پر ہی سہی، لکھنا اور پڑھنا دونوں سیکھا لیکن وہ کسی اسکول یا مدرسے میں داخل نہیں ہوئیں۔ سنِ بلوغ کو پہنچنے پر ان کی شادی پٹنہ کے مشہور وکیل محمد یحییٰ سے ہوئی جو خود بھی نامی گرامی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔

رشیدۃ النسا کو تعلیمِ نسواں سے بے حد دل چسپی تھی۔ اسی شوق کی تکمیل میں انھوں نے 1906ء میں "مدرسہ اسلامیہ" کے نام سے ایک زنانہ مدرسہ کھولا۔ اس کے معائنے کے لیے گورنر بنگال کی بیگم لیڈی فریزر خود پٹنہ آئیں۔ زنانہ مدرسہ اور لیڈی فریزر کا معائنہ اہلِ عظیم آباد کے لیے ایک نادر واقعہ تھا۔ آگے چل کر اسی مدرسے کو بادشاہ نواب رضوی نے بی۔ این۔ آر۔ اسکول کے نام سے منتقل کر دیا اور اسے جائداد عطا کی۔ بتیا کی رانی نے اس اسکول کے لیے ایک مکان بھی عطا کیا جس کی وجہ سے یہ بتیا ہاؤس بھی کہلاتا ہے۔ رشیدۃ النسا کا انتقال جولائی 1931ء میں ہوا۔

رشیدۃ النسا نے مغلیہ تہذیب کا ڈوبتا سورج اور انگریزی حکومت کا عروج اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ انھوں نے مسلم گھرانوں خصوصاً عورتوں کی زبوں حالی کا بہ غور معائنہ کیا تھا۔ عورتوں کی جہالت کو وہ اس کا ذمے دار سمجھتی تھیں۔ لہٰذا معاشرے میں پھیلی توہم پرستی، غلط عقاید، شادی بیاہ اور دیگر تقریبات کی فضول خرچیوں کو دور کرنے کے لیے انھوں نے ایک ناول "اصلاح النسا" کے نام سے لکھا۔ یہ ناول 1881ء میں لکھا گیا اور پہلی مرتبہ 1894ء میں طبع ہوا۔ اس ناول کی پہلی اشاعت پر ناول نگار کے نام کے بدلے تحریر تھا: "والدہ بیرسٹر محمد سلیمان"۔

"اصلاح النسا" پر ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں "مرأۃ العروس" اور "بنات النعش" کا گہرا اثر ہے اور خود ناول نگار نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ ناول کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ رشیدۃ النسا اپنے عہد کی کیسی روشن خیال خاتون تھیں۔ ان کے اصلاحی جذبے پر سرسیّد تحریک کے اثرات بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

اصلاح النسا

(اقتباس)

محمد معظم نے سوچا کہ بی بی شادی میں بیٹھیں یا نہ بیٹھیں، شادی کا انجام جلد ہی کر دینا ضروری ہے اور بیٹھیں گی کیوں نہیں، یہ صرف دھمکی ہی دھمکی ہے۔ لیکن کوئی انتظام کرنے والا گھر میں نہ تھا، اس لیے محمد معظم کو سخت تردّد پیدا ہوا۔ پھر ان کو خیال آیا کہ حسین گنج سے کریم النسا کو بلوا بھیجیں۔ یہ خیال کر کے کریم النسا کو بلوا بھیجا۔ جب کریم النسا آئیں تو محمد معظم نے کہا کہ بہن، میں نے تم کو جس کام کے واسطے تکلیف دی، وہ یہ ہے کہ تم بسم اللہ کی شادی کا انتظام کرو، سب قصہ کہہ سنایا اور کہا: اگر کر دو گی تو میں ہمیشہ تمھارا احسان مند رہوں گا۔

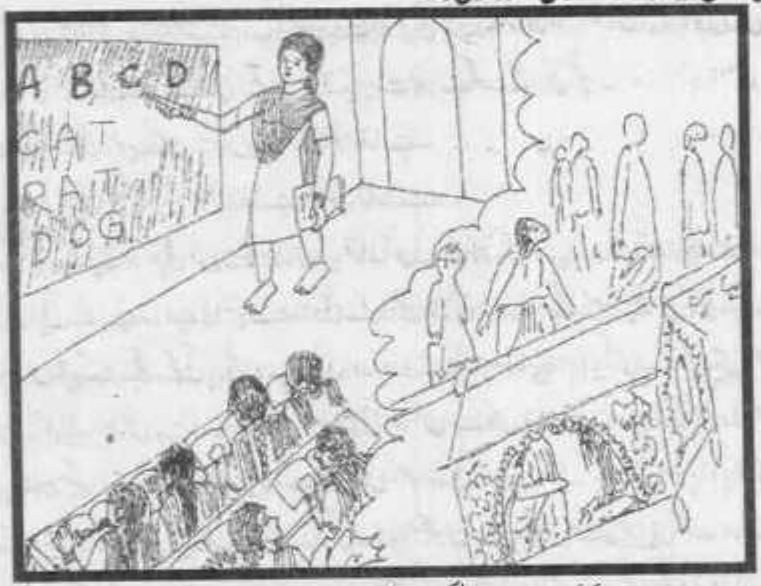

کریم النسا: بھیّا، احسان کی کون بات ہے لیکن بھابھی کا مزاج خراب ہے، وہ بہت ناراض ہوں گی۔ بہتر ہے کہ انھیں کے ہاتھ میں انتظام رہے اور وہ نہ مانیں تو ناچاری ہے۔

محمد معظم: میں یہ نہیں کہتا کہ وہ انتظام نہ کریں، اگر وہ انتظام اپنے ہاتھ میں لیں تو اس سے کیا بہتر ہے۔ مگر وہ کبھی راضی نہ ہوں گی۔

کریم النسا: میں سمجھاؤں؟ شاید مان جائیں۔

محمد معظم (بہن سے مخاطب ہو کر): اچھا تم سمجھاؤ۔ دیکھو اگر راضی نہ ہوں تو تم کو انتظام کرنا ضرور ہوگا۔ دیکھو سوائے تمھارے میرا کون ہے جو کرے گا۔ تم سامان شروع کر دو، ان کے بکنے کا خیال مت کرو۔

کریم النسا: پھر مجھے کیا عذر ہے، جو کہیے گا بہ سر و چشم بجالاؤں گی۔

جب محمد معظم بہن سے کہہ سن کر باہر چلے گئے تو کریم النسا نے بھاوج کو سمجھانا شروع کیا، بہت سمجھایا، مگر وہ کب کسی کی بات ماننے والی تھیں۔ میاں اور بیٹی کو کوسنے لگیں۔ کریم النسا مصلحت سمجھ کر چپ ہو رہیں۔ اب محمد معظم نے شادی کا سامان کرنا شروع کیا۔ چیزوں کی خریداری شروع ہوگئی، کپڑے لتے سے دال، چاول، مسالا، گھی وغیرہ تک خرید کر محمد معظم گھر میں بھیجتے اور کریم النسا اس کو سلیقے سے رکھواتیں۔ گھر کی ماما اصیلیں بڑی چور تھیں؛ اس لیے کریم النسا نے قفل لگا کر کنجی اپنے ہاتھ میں رکھی۔ کپڑے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ طرح طرح کے کپڑے، بنت گوکھرو پٹھا چکی وغیرہ وغیرہ سب خرید ہو کر گھر میں آئی۔ جب چیزیں گھر میں آتیں، بسم اللہ کی ماں کوسنے لگتیں اور کہتیں کہ بسم اللہ اور بسم اللہ کے باپ کے پھول اور چہلم میں خرچ ہوگا اور کپڑا املنا (یعنی ملا) قرآنی کو ملے گا۔ کریم النسا سے یہ سب سن کر رہا نہ گیا، چپ رہتے رہتے جی الٹنے لگا۔ گھبرا کر بول اٹھیں کہ بھابھی جان، آپ یہ سب کیا واہیات بکا کرتی ہیں۔ بسم اللہ اور بسم اللہ کے باپ کے دشمن کا پھول اور چہلم ہو۔ اتنا سن کر بسم اللہ کی ماں کہنے لگیں کہ تم ہی کہو کہ یہ نسبت میرے گھر کے لائق تھی۔

کریم النسا: اگر روپیہ نہیں ہے تو کیا ہوا، لڑکا تو اچھا ہے۔

بسم اللہ کی ماں: تم کیا کہتی ہو کہ اچھا ہے، خاک اچھا ہے۔

محمد معظم نے پہلے تو شرعی شادی کا سامان کیا تھا۔ آمدنی کے جو کچھ روپے آئے تھے، اسی سے سب انتظام ہو چکا تھا، اب عرفی شادی کے لیے روپے کی ضرورت ہوئی۔ مہاجن تلاش ہونے لگے۔ موقعے کی کیفیت لے کر دلال تمام مہاجنوں کے یہاں پھرنے لگے۔ کوئی پانچ روپے دلالی اور دو روپے سیکڑا سود کا پیغام لایا، کسی نے اس میں بکھیڑا پھیلایا اور رقم سلامی کی اس پر بڑھایا۔ الغرض بہ ہزار دقت خرابی و پریشانی مہاجن سے دس ہزار روپے لیے گئے۔ فوراً بسم اللہ کی ماں نے پانچ ہزار روپے اندر منگوا لیے، انتظام شادی کا اب ہاتھ میں بسم اللہ کی ماں کے آیا۔ کریم النسا اوپرا اوپر کا کام کرنے لگیں۔ بے انتظامی کے سبب سے چیزوں کی بربادی ہونے لگی۔ ماما اصیلوں کے ہاتھوں سے چیزیں تلف ہونے لگیں، چوری کا بازار گرم ہوا۔ کریم النسا کی ساری محنت اکارت گئی۔ وہ دیکھتی تھی اور افسوس کر رہ جاتی تھی، کرتی کیا؟ اب تو انتظام رہا نہ حفاظت، سارا کارخانہ ہوڑ لو ہو گیا۔ محمد معظم نے برات کی تاریخ مقرر کرنی چاہی تو گھر میں بسم اللہ کی ماں نے کہلا بھیجا کہ اس میں اور کسی کو تاریخ مقرر کرنے کا حق نہیں ہے۔ نہیں معلوم نیک یا بد تاریخ مقرر ہو جائے۔ برہمن کو بلا کر تاریخ خوب دیکھ سن کر مقرر کی جائے۔ ہر چند محمد معظم نے سمجھایا کہ مولوی صاحب سے میں نے سعد و نحس دریافت کر لیا ہے۔ لیکن کون سنتا ہے۔ ایک ماما جا کر محلے کے پانڈے کو دروازے پر بلا لائی۔ گھر میں سے سوپ میں اروا چاول پانچ سیر، پانچ گرہ ہلدی، تھوڑی دوب، پانچ روپے پروتا آیا۔

پانڈا: ہم بہت مدت سے آسرا لگائے ہوئے ہیں، پرمیشر نے دن دکھایا ہے، اے ہی پر سو روپیہ لے جا کے کھا

چکے ہیں، ہماری برت ہے، پانچ روپیہ ہم نہیں لیں گے۔

غرض ردوکد سے پچاس روپے پر تصفیہ پایا۔ پانڈے جی نے پترا دیکھ کر اور خوب بچار کر کے اکیسویں کو خواجہ معین الدین کی برات کی تاریخ ٹھہرائی۔ جب برات کی تاریخ مقرر ہوگئی تو اسی کے ساتھ مانجھے کا دن بھی مقرر ہوگیا۔ بسم اللہ کی ماں نے چاہا تھا کہ شہر کے دستور کے مطابق ساچق و منہدی کے لیے بھی الگ الگ دن مقرر کیے جائیں۔ مگر جب یہ بات منظور نہیں ہوئی تو بسم اللہ کی ماں نے بھی کچھ زیادہ بکھیڑا نہیں کیا اور یہ قرار پایا کہ جمعہ کے دن مانجھا جائے۔ اب تیاری مانجھے کی ہونے لگی۔ جمعہ کے دن تین بجے تک گھر میں بسم اللہ کی ماں کے ہاں مہمانوں کا ہجوم ہوگیا۔ گانے والیاں آئیں، گانا بجانا شروع ہوا، تین بجے لڑکی مانجھے بٹھائی گئی۔ بسم اللہ جس قدر زیور پہنے تھی سب اتار دیے گئے۔ یہاں تک کہ چوڑیاں بھی اتار دی گئیں اور سات سہاگنوں نے انھیں اپنے اپنے گال سے چھوا کر بسم اللہ کو لگایا، داہنے ہاتھ میں کنگنا باندھا گیا۔ جس وقت یہاں رسمیں ہو رہی تھیں، زنانے دروازے پر آدمی پکار رہے تھے کہ مانجھے کی چیزیں باہر بھیج دو، دیر ہوئی جاتی ہے۔ مگر گانے بجانے کا اس قدر گھر میں غل تھا کہ کسی کے کان تک پکارنے والے کی آواز نہیں پہنچتی تھی۔ بڑی دیر ہوگئی اور یہ لوگ چلا چلا کر تھک گئے۔ جب گانا موقوف ہوا تو باہر کے پکارنے والے کی آواز سن کر ایک ماما چلاتی ہوئی دوڑی "اے لوگو چپ رہو کتنا غل ہے، باہر کے لوگ کشتی مانگ رہے ہیں، میاں دروازے پر کھڑے ہیں، اے لوگو چپ بھی رہو۔" اس ماما کے چلانے سے غل کسی قدر کم ہوا تو معلوم ہوا کہ باہر سمدھیانے جانے کی چیزیں مانگی جاتی ہیں۔ ایک چاندی کی چوکی، کشتیاں، خوانچے تیار ہوئے تھے۔ وہ سب باہر جانے لگے، ایک کشتی میں دولھا کے لیے مانجھے کا جوڑا تھا، زرد رنگ کا انگرکھا، مشروع کا پایجامہ، زرد کرتا، سرخ رنگ کا رومال جس کے چاروں طرف گوٹا لگا ہوا، زری کی ٹوپی، زرکا جوتا بھاری کام کا، یہ سب چیزیں ایک کشتی میں تھیں اور پھول، چنگیر، طرہ، بدھی اور ہار تھے۔ یہ سب چیزیں نہایت عمدہ تورہ پوش سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ دوسری کشتی میں ایک تھالی چاندی کی، اس تھالی میں سات پینڈیاں، اس میں ایک زرد رنگ کا کنگنا تھا۔ کچھ کارچوبی کا کام کیا ہوا جو اسپندورا دے کر بنایا گیا تھا اور اسی کشتی میں ایک دوسری تھالی میں سات بیڑے پان کے ورق نقرہ لگے ہوئے، اور ایک کپی میں تیل چنبیلی کا جس کے منہ پر سرخ کپڑا گوٹہ لگا ہوا بندھا تھا۔ یہ سب چیزیں رکھ کر ایک تورہ پوش کشتی پر ڈال دیا۔ اس کے سوا کچھ خوانچے اور تھے جس میں گیارہ پسیری پینڈیاں تھیں اور بہت سے خوانچے خالی تھے، ان میں تھوڑا چور صرف مٹھائیوں کا ڈال دیا تھا، یہ سب زینت کے لیے تھے۔ باجے کے ساتھ مانجھا روانہ ہوا اور باجے بھی ایسے مہیب آواز کے جس سے دل دھڑک جائے اور کانوں کو تکلیف پہنچے۔ یکے گاڑی کے گھوڑوں کی قطار، اونٹ اور ہاتھی وغیرہ جو کرائے پر یا منگنی منگائے گئے تھے، سب ساتھ تھے، سب کے پیچھے مانجھے کی چوکی کشتیاں اور خوانچے متعدد مگر اکثر خالی، اگر خوان پوش کہیں (ہوا سے) اڑا تو حقیقت کھل گئی، مانجھے کے ساتھ کچھ شریف لوگ بھی تھے، اس تکلف سے مانجھا روانہ ہوا اور اس کے بعد سواریاں روانہ ہونے لگیں۔ مکان محمد اعظم کا قریب تھا، سواریاں جلد جلد اتر گئیں اور مانجھا کہیں شام کے وقت تمام سڑک اور گلیوں سے گردش کرتا ہوا پہنچا۔

شہزادی: ہم تو پڑھنے کو تعلیم سمجھتے تھے۔ آج ہم کو نئی بات معلوم ہوئی کہ پڑھنا اور چیز اور تعلیم اور چیز ہے۔

اشرف النسا: تعلیم میں پڑھنا تو داخل ہے مگر پڑھنے کے ساتھ ادب، تمیز، اخلاق کی باتوں کی تعلیم نہ ہو تو پڑھنا بے کار ہے۔ جس طرح لاڈلی نے کلام اللہ و مسئلہ کی کتابیں پڑھیں، اب نماز تک نہیں پڑھتی ہیں، دل بہلانے کے لیے قصے کہانی کی کتابیں پڑھتی ہیں۔ ان کو لکھنے پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

شہزادی: بھابھی، آپ نے سنا ہے کہ اسی شہر میں کوئی مکتب لڑکیوں کے پڑھنے کا ہے۔ جس میں پانچ چھے برس کی لڑکیاں چھے مہینے میں قرآن شریف خاصی طرح سے پڑھنے لگتی ہیں۔

اشرف النسا: ہم کو خوب معلوم ہے۔ حکیم احمد حسین صاحب نے یہ مکتب کھولا ہے، ان کو لوگ صوفی صاحب کہتے ہیں۔ میرے محلّے کی بھی لڑکیاں اس مکتب میں پڑھنے جاتی ہیں۔

لاڈلی: اب کوئی وہاں اسکول بھی لڑکیوں کا بنے گا، لڑکیاں انگریزی بھی پڑھیں گی۔

اشرف النسا: کوئی علم ہو، اس کے حاصل کرنے میں بُرائی نہیں ہے لیکن ہم لوگوں کے یہاں لڑکیوں کو عربی، فارسی، اردو کتابیں کب پڑھائی جاتی ہیں؟ جس سے خدا اور رسول کے احکام معلوم ہوں، بدعت، فضول خرچ، کفر شرک سے بچیں، دین ایمان کی باتیں سیکھیں۔ اس مکتب کے پڑھنے میں عیب کیا ہے؟ جو تم یوں کہتی ہو، اس میں پہلے تو کلام اللہ صحیح پڑھایا جاتا ہے۔

لاڈلی: لڑکیوں کا مدرسہ میں جانا تو اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اس روز مبارک چچا بھی تو کہتے تھے کہ ہم کو لڑکیوں کا پڑھنا مدرسہ میں جا کر بُرا معلوم ہوتا ہے، زیادہ پڑھ کر کیا کریں گی؟

اشرف النسا: تم کو اس مکتب کا حال تو معلوم نہیں ہے، جھٹ پٹ اعتراض کرنے لگیں۔ وہاں چھوٹے چھوٹے لڑکے بھی پڑھتے ہیں اور لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں۔ لڑکوں کے پڑھنے کے واسطے مکان الگ ہے اور لڑکیاں زنانے میں پڑھتی ہیں۔ حکیم صاحب کی بی بی پڑھاتی ہیں۔ وہاں پانچ برس کا لڑکا بھی جانے نہیں پاتا۔ خود حکیم صاحب بھی جو ایک مقدس اور سن رسیدہ آدمی ہیں، وہ لڑکیوں کے پڑھنے میں نگرانی کرتے ہیں۔ اگر وہاں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں پڑھتی ہیں تو کون سی برائی ہے؟ اور مبارک چچا کی بات رہنے دو، وہ کیوں نہیں برخلاف ہوں گے؟ اگر ان کی بی بی پڑھی لکھی ہوتیں تب ہم دیکھتے کہ وہ دوسروں کو پڑھنے سے روکتے۔

لاڈلی: ایسے ہی پڑھانا ہے تو لوگ آتور کھ کر کیوں نہ پڑھاویں؟ مکتب میں بھیجنے کی کیا ضرورت ہے؟

اشرف النسا: فقط لکھنا پڑھنا ہی تو لڑکیوں کے حق میں بہتر نہیں ہے بلکہ اچھی بات بھی تو سیکھنا چاہیے۔ صوفی صاحب کے مکتب میں پڑھنے کے علاوہ اچھی باتوں کی بھی تعلیم ہوتی ہے، (اسی کو تربیت کہتے ہیں)۔ جو لڑکی مکتب میں پڑھنے جاتی ہے تو پہلا حکم مولوی صاحب موصوف کا یہ ہوتا ہے کہ لمبی آستین کا کرتا، سنگین کپڑے کا دوپٹا، چھوٹے پایے کا پائجامہ پہنو، سر میں قصابہ باندھ کر مکتب آؤ۔ نماز کی تعلیم ہوتی ہے، ادب، قاعدہ، تمیز سکھایا جاتا ہے۔ جن لڑکیوں نے صوفی صاحب سے پڑھا ہے، ایسی شایستہ ہوگئی ہیں کہ ہم کیا بیان کریں۔ دو روپے مہینے کی آتو سے گھر میں تعلیم نہیں ہو سکتی ہے کیوں کہ آتو کو خود کچھ پڑھنا تو آتا ہی نہیں ہے سوائے قرآن شریف کے، وہ بھی غلط، اور پڑھانا کیا آوے گا؟ اگر کسی گھر میں

آتو رکھی بھی جاتی ہے تو دو روپے مہینے سے زیادہ نہیں مل سکتا، پڑھنا تو آتا ہی نہیں، لڑکی کو رات دن بٹھائے رہتی ہیں، جو کچھ ذہن حافظہ ہے، وہ بھی بیٹھے بیٹھے کند ہو جاتا ہے۔ لڑکی کو حکم ہے کہ طوطا مینا کی طرح رٹا کرو۔ برسوں میں لیاقت نہیں ہوتی ہے۔ اس قدر ماں کو آرام ہوتا ہے کہ ماما، باورچن، چاول دال زیادہ چُراتی تھی، جب سے آتو جی نوکر ہوئیں، وہ اپنے سامنے جنس تلوا دیتی ہیں، تب سے چوری نہیں ہوتی ہے۔ لڑکی پڑھے یا نہ پڑھے آتو جی کی خاطر ہوتی ہے۔ دل میں آتو جی خدا سے دعا مانگتی ہیں کہ یا اللہ قرآن جلدی ختم نہ ہو، میری نوکری تو رہے۔ اور ظاہر میں لڑکی پر غصہ کرتی ہیں کہ کیسی لڑکی ہے؟ پڑھتی نہیں۔ آتو جی کے ساتھ لڑکیاں اور بھی لڑائی جھگڑا سیکھتی ہیں اور یہی عادت لڑائی کی رہ جاتی ہے۔ لڑکیوں کی بے تعلیمی کے سبب سے لڑکے بھی پوری تعلیم پا نہیں سکتے ہیں۔

ابّا جان کہتے تھے کہ انگریزوں کی عورتیں پڑھی لکھی تعلیم یافتہ ہوتی ہیں، اس وجہ سے ان کے لڑکے اور لڑکیاں سب تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ بے تعلیم لوگ اپنی زندگی کے دن بڑی مصیبت سے پورے کرتے ہیں۔ اس لیے میرا ارادہ بہت دنوں کا تھا کہ میں ایک کتاب ایسی لکھوں جو ظاہر میں بہ طور بچّے قصّے کے ہو اور در حقیقت اس میں اچھی اچھی نصیحتیں ہوں اور جن بُری رسموں اور فضول باتوں کی وجہ سے عورتیں بے کار روپے برباد کرتی ہیں، خدا کی گنہگار ہوتی ہیں، مصیبتوں میں مبتلا ہو جاتی ہیں، ان بُری رسموں کی پوری پوری تصویر اتاروں تا کہ اس کتاب کے پڑھنے سے میری ہم جنسوں کو دینی، دنیاوی فائدے پہنچیں، اور خدا سے میری یہ التجا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو مقبول خاص و عام فرمائے۔

لفظ و معنی

تردد	-	فکر، اندیشہ
بہ سر و چشم بجا لانا	-	بغیر حجت اور ہچکچاہٹ کے کسی بات / حکم کا مان لینا
بنت	-	ایک طرح کی توئی کا نام جس میں گوکھرو سلما ستارا لگا ہوا ہوتا ہے۔
توئی	-	ایک قسم کے کپڑے پر بُنی ہوئی بیل جو عورتیں دوپٹوں اور رضائیوں وغیرہ پر لگاتی ہیں۔
گوکھرو	-	کان کا ایک زیور، سونے چاندی کے تاروں کا موڑا ہوا گوٹا
پٹھا	-	ایک طرح کا زرباف جس کو عورتیں دوپٹوں پاجاموں پر گرداگرد لگا لیتی ہیں۔
چٹکی	-	گوٹے اور لچکے کو موڑ کر جو کنگرے دار بناتے ہیں، اسے چٹکی کہتے ہیں۔
ماما اصیل	-	لونڈی، باندی، کنیز
قفل	-	تالا
پھول	-	مسلمان مُردوں کے تیسرے یا پانچویں دن کا فاتحہ جس میں پھول اٹھائے جاتے ہیں، سوم
جی الٹنا	-	دل گھبرانا، دل پریشان ہونا
شرعی	-	مذہبی اصول اور حکم

عرفی شادی - دھوم دھڑاکے کی شادی

بکھیڑا پھیلانا - جھگڑا پھیلانا، الجھاو پیدا کرنا

رقم سلامی - کسی خدمت کے عوض لیا جانے والا پیسہ

تلف ہونا - برباد ہونا

اکارت ہونا - برباد ہونا

ہوڑلو ہونا - بکھر جانا

سعد - مبارک، نیک

نحس - نامبارک، منحوس

پرونا - آٹا، چاول، گڑ، ہلدی وغیرہ جو کسی تقریب پر خدمتی یکین کو دیا جاتا ہے

پرمیشر - خدا، بھگوان

رَدّوکَدّ - حجت، مباحثہ

مانجھے کا دن - جس دن دولھا دولھن کو زرد رنگ کا جوڑا مائیوں میں پہنایا جاتا ہے، اسے مانجھے کا دن کہتے ہیں۔

ساچق کا دن - شادی سے ایک دن پہلے کچھ ٹھلیاں، شیرینی اور دولھن کا لباس وغیرہ دولھا کے گھر سے دولھن کے گھر لے جاتے ہیں، اسے ساچق یا ساچق کا دن کہتے ہیں۔

مہندی - ایک رسم کا نام جس میں دولھا کے گھر سے دولھن کے یہاں مہندی کے ساتھ سنگار کی اور چیزیں بھیجتے ہیں۔

کشتی - ایک مستطیل لکڑی کا تختہ جس کے چاروں طرف چار لکڑیاں جڑی ہوتی ہیں۔ یہ ظرف پیالے چننے یا پوشاک رکھنے کے کام میں لایا جاتا ہے۔

خوانچہ - چھوٹا خوان یا سینی

گوٹا - کناری، چاندی یا سونے کے تاروں کا بُنا ہوا

چنگیر - پھولوں کی ٹوکری، خوان کا سرپوش

طرہ - وہ پھندنا جو پگڑی کے اوپر لگاتے ہیں۔

بدھی - پھولوں کا ہار

تورہ - مختلف کھانوں کے خوان

چینڈی - ایک قسم کا لڈو

کنگنا - وہ کلاوے کا ڈورا جو پھیروں کے وقت دولھا کی داہنی کلائی اور دولھن کی بائیں کلائی میں باندھا جاتا ہے۔

کارچوبی - زردوزی، کشیدہ کاری

مشروع - ایک طرح کا کپڑا
بدعت - دین میں کوئی نئی بات نکالنا
شرک - خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک جاننا، کفر
سن رسیدہ - بوڑھا، عمر دراز، پہنچا ہوا
آتو - گھر پر پڑھانے والا/ والی، ٹیوٹر
سنگین کپڑا - دبیز کپڑا، ٹھوک کر بنا ہوا کپڑا
موصوف - وہ جس کی تعریف کی جائے
قصابہ - وہ رومال جو عورتیں سر میں باندھتی ہیں
شایستہ - مہذب، باتمیز

آپ نے پڑھا

- رشیدۃ النسا اردو کی پہلی خاتون ناول نگار ہیں۔ ان کا ناول "اصلاح النسا" 1894ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول ڈپٹی نذیر احمد کے دو ناولوں "مراۃ العروس" (1869ء) اور "بنات النعش" (1873ء)، سے متاثر ہو کر لکھا گیا۔ یہ ناول بھی مسلمان عورتوں کی اصلاح کی خاطر لکھا گیا۔ اس کا یہ پہلو سب سے زیادہ قابلِ توجہ ہے کہ اس میں پہلی بار کسی خاتون نے گھر کے اندر ہونے والے معاملوں کی آنکھوں دیکھی بات لکھی۔
- انیسویں صدی کے اواخر میں مسلم گھرانوں کے جو معاشرتی احوال تھے اور اُن گھرانوں کی عورتوں کو جن مسائل کا سامنا تھا، ان کی پیش کش کے لیے بعض واقعات کا اس ناول میں مصنفہ نے انتخاب کیا ہے۔ ان گھروں میں مذہب کے تئیں عورتوں کے فرسودہ تصوّرات اور مشرکانہ اعمال، تقریبِ شادی میں ان کے حد درجہ بے ہودہ اور خرچیلے رسومات اور تعلیم کی طرف سے بے توجہی جیسے امور سے یہ ناول مکمل ہوا ہے۔
- رشیدۃ النسا روشن خیال خاتون تھیں۔ اپنے زمانے کے مسلم گھرانوں میں پھیلی ہوئی بُری رسموں اور رواجوں کی وہ مخالف تھیں۔ توہم پرستی، ٹونے ٹوٹکے اور غلط قسم کے عقیدوں کے خلاف اپنے ناول 'اصلاح النسا' کے ذریعہ انھوں نے آواز اُٹھائی۔ اُنھوں نے اُس زمانے میں یہ ناول لکھا جب ناول لکھنا تو کجا، اس کا پڑھنا بھی مسلم عورتوں کے لیے حد درجہ معیوب سمجھا جاتا تھا۔ انھوں نے عورتوں کی تعلیم کی اہمیت پر اس ناول میں زور دیا۔
- ناول کے پیشِ نظر اقتباس میں مکالمے خاصے طویل ہیں۔ ان سے کرداروں کی شخصیت پوری طرح پہچان میں آجاتی ہے۔ مرد، عورت، مالک، غلام، بی بی وغیرہ کی زبان سے جو مکالمے پیش کیے گئے ہیں، وہ حد درجہ فطری ہیں اور ان کرداروں کی سماجی حیثیتوں کے عین مطابق ہیں۔ ناول کی زبان آسان اور سلیس ہے۔ مسلم گھرانے کی روزمرّہ کی گفتگو کو اظہار میں اپنایا گیا ہے۔ رشیدۃ النسا نے عورتوں کی بامحاورہ زبان استعمال

کی ہے۔ ان کی اس تحریر سے آج سے تقریباً سوا سو برس قبل کی زبان اور سماجی احوال کا پتا چلتا ہے۔

- ڈپٹی نذیر احمد کی اصلاحی تحریک سے متاثر ہو کر مسلمان عورتوں کی جہالت، توہم پرستی اور شادی بیاہ کی تباہ کن رسموں کے خلاف قلمی جہاد کا آغاز پٹنہ شہر کی ایک خاتون رشیدۃ النسا نے کتاب لکھ کر کیا جو کہ ''مراۃ العروس'' اور ''توبتہ النصوح'' کی طرح دوامی افادیت کا حامل ہے۔ چوں کہ اس کتاب میں عورتوں کی اصلاح مقصود تھی، اس لیے مصنفہ نے اس کا نام ''اصلاح النسا'' رکھا۔
- رشیدۃ النسا اردو کی پہلی خاتون ناول نگار ہیں۔ انھوں نے یہ ناول 1881ء میں لکھ لیا تھا۔ تیرہ برس تک اس کی اشاعت ممکن نہ ہو سکی۔ جب ان کے صاحب زادے محمد سلیمان لندن سے بیرسٹری کی سند لے کر واپس لوٹے تو انھیں اس مسودے کی اشاعت کا خیال آیا اور پھر یہ کتابی صورت میں 1894ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس زمانے کی رسم کے مطابق مصنفہ کے نام کی جگہ ''والدہ بیرسٹر محمد سلیمان بار ایٹ لا'' لکھا گیا۔
- رشیدۃ النسا بہار کے ایسے خاندان میں پیدا ہوئیں جو ہندستان کے چنے چنے عالم و فاضل گھرانوں میں سے تھا۔ وہ صدر اعلیٰ (چیف جسٹس) شمس العلما خان بہادر وحید الدین کی بیٹی تھیں اور صاحب دیوان شاعرہ نثار فاطمہ کبریٰ کی ماں تھیں۔ لیکن رشیدۃ النسا کو اس بات کا رنج تھا کہ عورتیں اس وقت تعلیم سے محروم تھیں۔
- پردہ نشیں رشیدۃ النسا نے اس زمانے میں یہ ناول لکھا جب عورتوں کا لکھنا تو دور، پڑھنا بھی مشکل تھا۔ وہ اپنے ناول میں لڑکیوں کے لیے کھلنے والے اسکول، انگریزی تعلیم اور طب کی تعلیم کی حمایت کرتی ہیں۔ وہ لڑکیوں کے گھر سے نکل کر اسکول جانے کے فوائد بھی بیان کرتی ہیں۔

اس ناول میں

- جہالت کیسا عذاب ہے، اس کا نقشہ اس ناول میں انھوں نے بہ خوبی کھینچا ہے۔ بسم اللہ اور اس کی ماں چوں کہ جاہل ہیں، اس لیے ذاتی زندگی میں بھی ناکام اور بے چین ہیں۔ عورت مرد کی مساوات اور برابری کے مواقع پر بھی وہ روشنی ڈالتی ہیں۔ تعلیم کی اہمیت اُن کے نزدیک دولت سے زیادہ ہے۔ ''علم بڑی دولت ہے۔ روپیہ پیسہ اس کے سامنے کچھ نہیں ہے''۔ ڈائن جیسے خطرناک مسئلے پر بھی وہ قلم اُٹھاتی ہیں۔
- کردار کے لحاظ سے بسم اللہ کی ماں، بسم اللہ، رحمت النسا اور اشرف النسا کی عمدہ مثالیں اس ناول میں موجود ہیں۔ وزیرن کا کردار جو منفی ہے، سب سے زوردار ہے۔ وہ ضعیف الاعتقاد عورتوں کو بے وقوف بنا کر خوب کمائی کرتی ہے۔ وزیرن کا یہ کاروبار محمد اعظم کے خاندان کی دوسری پیڑھی تک پروان چڑھا۔ لیکن تیسری نسل میں ایک پڑھی لکھی خاتون سردار دولھن کے آجانے سے وزیرن کی اصلیت سب پر کھل جاتی ہے۔

آپ بتائیے

1- 'اصلاح النسا' کی مصنفہ کا تعلق کس زمانے سے ہے؟
2- کیا 'اصلاح النسا' اردو کا پہلا ناول ہے جسے کسی خاتون نے مسلم عورتوں کی اصلاح کے لیے لکھا؟
3- 'اصلاح النسا' کا سنہ اشاعت کیا ہے؟
4- کس نے لڑکیوں کا مکتب قائم کیا؟
5- تعلیم کے مقصد سے متعلق کس کردار کے مکالمے ہیں؟
6- محمد معظم نے بسم اللہ کی شادی کا انتظام کریم النسا کے ہاتھ میں کیوں دیا؟
7- 1894ء میں مصنفہ کا نام ناول پر کیوں نہیں لکھا گیا تھا؟
8- اس ناول کا نام "اصلاح النسا" کیوں رکھا گیا؟

مختصر گفتگو

1- کریم النسا کے متعلق پانچ جملے درج کیجیے۔
2- بسم اللہ کی ماں کے کردار سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے؟
3- بسم اللہ کی شادی کے موقع پر کیا کیا رسمیں ادا کی گئیں؟
4- توہم پرستی کیا ہے؟ اس کی کوئی ایک مثال شاملِ نصاب حصے سے دیجیے؟
5- مانجھا کیا ہوتا ہے؟ اس میں کیا کیا رسمیں کی جاتی ہیں؟ دولھا کے لیے مانجھے کا کیا سامان بھیجا گیا؟

تفصیلی گفتگو

1- ناول "اصلاح النسا" کے شاملِ نصاب حصے کا خلاصہ تحریر کریں؟
2- شاملِ نصاب حصے کی روشنی میں ناول نگار 'رشیدۃ النسا' کی کردار نگاری کی صلاحیت واضح کیجیے؟
3- کریم النسا اور بسم اللہ کی ماں کے کرداروں کا موازنہ کیجیے؟
4- "ہم تو پڑھنے کو تعلیم سمجھتے تھے۔ آج ہم کو نئی بات معلوم ہوئی کہ پڑھنا اور چیز اور تعلیم اور چیز ہے۔"
اس جملے کی وضاحت کیجیے اور کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں؟ دلیل دیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1- انیسویں صدی کے جن ناول نگاروں کے نام آپ کو معلوم ہوں، اسکول کی لائبریری سے اُن کی کتابیں تلاش کیجیے اور ان کی فہرست بنائیے۔
2- خاتون افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کی فہرست تیار کیجیے اور ان میں سے پانچ کے حالاتِ زندگی لکھیے۔
3- چند دوسری خواتین ناول نویسوں کی فہرست تیار کیجیے اور ان کی دس کتابوں کے نام لکھیے؟

غضنفر

غضنفر 9 مارچ 1953ء کو بہار کے گوپال گنج ضلع کے چورانو میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گانو کے مدرسے اور اسکول میں پائی۔ گوپال گنج کالج سے بی۔اے۔ کرنے کے بعد بہار یونی ورسٹی، مظفر پور میں ایم۔اے۔ (اردو) کے لیے داخلہ لیا لیکن 1974ء کی تحریک کی سرگرمیوں کی وجہ سے صوبۂ بہار میں یونی ورسٹیاں بند کر دی گئیں اور اسی دوران غضنفر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی پہنچ گئے جہاں سے انھوں نے اردو زبان و ادب میں ایم۔اے۔ اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔

تدریسی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز علی گڑھ میں عارضی لکچرر کی حیثیت سے ہوا۔ پھر یونین پبلک سروس کمیشن نے ان کا سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز کی اکائی اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر، سولن (ہماچل پردیش) میں بحیثیت لکچرر تقرر کیا۔ بعد میں اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر، لکھنؤ کے پرنسپل کے لیے ان کا یو۔پی۔ایس۔سی۔ کے ذریعہ انتخاب عمل میں آیا۔ فی الوقت وہ اسی عہدے پر فائز ہیں اور لکھنؤ میں مقیم ہیں۔

غضنفر کی ادبی زندگی کا آغاز ایک ہندی ڈراما "کوئلے سے ہیرا" سے ہوا۔ اس کی اشاعت 1971ء میں ہوئی تھی۔ "مشرقی معیارِ نقد" عنوان سے انھوں نے 1978ء میں ایک تنقیدی کتاب شائع کی۔ اس دوران وہ لگاتار نظمیں، غزلیں کہتے رہے اور رسائل میں ان کی اشاعت بھی ہوتی رہی۔ لیکن ہماچل پردیش میں ملازمت کے زمانے میں انھوں نے فکشن کی طرف توجہ کی۔ 1989ء میں ان کا ناول "پانی" شائع ہوا۔ اسی زمانے میں عبدالصمد کا ناول "دو گز زمین" اور پیغام آفاقی کا ناول "مکان" منظرِ عام پر آئے۔ ان تینوں ناولوں کو ہم عصر اردو ناولوں کی تاریخ میں نشاۃ الثانیہ کا درجہ حاصل ہے۔

غضنفر نے "پانی" سے جو سلسلہ قائم کیا، وہ کینچلی (1993ء)، کہانی انکل (1994ء)، ہم (1998ء)، دویہ بانی (2000ء)، فسوں (2003ء)، وش منتھن (2004ء) کی متواتر اشاعتوں سے مزید مستحکم ہوا۔ "زبان و ادب کے تدریسی پہلو" اور "تدریسِ شعر و شاعری" ان کی دیگر علمی کتابیں ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔ 2006ء میں ان کے افسانوں کا مجموعہ "حیرت فروش" کے نام سے شائع ہوا۔ "دویہ بانی" کا ہندی زبان میں بھی ترجمہ شائع ہوا۔

معاصر فکشن نویسوں میں غضنفر اپنے تجرباتی ذہن کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ایک ناول کے بعد دوسرے ناول میں ان کا بدلا ہوا اسلوب اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی نثر میں بے پناہ انشا پردازانہ قوت موجود ہے۔ داستانی زبان، استعاراتی زبان اور روایتی بیانیہ ہر انداز کو انھوں نے اپنے ناولوں میں آزمایا ہے۔

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

پانی

(اقتباس)

بے نظیر ایک ہارے ہوئے جواری اور ناکام شکاری کی صورت پہاڑ کی چوٹی سے نیچے اترا اور لڑھکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

پیڑوں سے ٹکراتا..... پہاڑوں سے پھسلتا اور پتھروں سے ٹھوکر کھاتا..... ڈگمگاتا..... گرتا..... سنبھلتا بیابان کی ایک ایسی وادی میں پہنچا جہاں اسے ایک بڑی سی عمارت اور عمارت میں جھلملاتی ہوئی روشنی دکھائی پڑی۔ دشت دیدہ خزاں رسیدہ آنکھیں چمک اٹھیں۔ پانو روشنی کی سمت بڑھ گئے۔

وہ ایک عظیم الشان دروازے میں داخل ہوا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا ایک وسیع و عریض ہال میں پہنچ گیا۔

حیرت انگیز ہال کے اندر اسے گھڑوں جیسے سر اور نادار بونوں کی طرح دھڑ والی عجیب الہیئت محیر العقول مخلوق اپنی بڑی بڑی بے ڈول آنکھوں پر موٹے موٹے عینک چڑھائے مختلف الانواع مشغلوں میں مشغول نظر آئی۔

بے نظیر کی آنکھیں پھیل گئیں۔ نگاہیں ہال کی حیرت افزا اشیا کے محاسبے میں مصروف ہو گئیں۔

سفید دیواروں پر سیاہ برقی تاروں کا سلسلہ اوپر سے نیچے، نیچے سے اوپر..... دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں تک مکڑی کے جالے کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ شفاف شیشے کی چھت پر روشنی کی نہریں بہہ رہی تھیں جن کے اندر سے رنگ برنگ کے ہیولے ابھر رہے تھے۔

دیواروں کے کنارے چاروں طرف تھوڑی تھوڑی سی دوری پر لمبی چوڑی میزیں بچھی تھیں جن پر طرح طرح کی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ میزوں کے پاس محیر العقول مخلوق مطالعوں، مشاہدوں اور مراقبوں میں مستغرق تھی۔

ان میں سے کچھ کے آگے بڑی بڑی ضخیم کتابوں کے اوراق کھلے تھے۔ کچھ کے سامنے کانچ کے چھوٹے بڑے جاروں میں رنگ برنگ کے رقیق مادّے بھرے پڑے تھے۔

کچھ میزوں کے اوپر عجیب و غریب قسم کے برقی آلات بکھرے پڑے تھے تو کچھ کے اوپر دخانی اوزار گڑے تھے۔

کچھ نگاہوں کے آگے ایک بورڈ پر برقی قمقمے جل بجھ رہے تھے جن کے بٹنوں پر اُن کی چھوٹی چھوٹی انگلیاں ٹکی تھیں اور نظریں بورڈ پر بنی مختلف سائز کی گھڑیوں کی چھوٹی بڑی سوئیوں کے حرکات و سکنات پر مرکوز تھیں۔

کچھ اُنگلیاں بجلی کے نیلے پیلے، ہرے اُجلے اور سرخ تاروں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے میں مشغول تھیں۔

کچھ کی آنکھیں چھت پر اُبھرنے والے ہیولوں پر مرکوز تھیں تو کچھ کی نگاہیں خوردبین کے شیشوں پر جھکی تھیں۔

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

بے نظیر انوکھی اشیا کی جاذبیت اور عجیب الہیت ہستیوں کی محویت میں منہمک تھا کہ اسے اپنی پشت پر انگلیوں کی ہلکی سی تھپتھپاہٹ محسوس ہوئی۔ نگاہیں پیچھے پلٹ آئیں۔ ویسی ہی ایک عجیب الہیت ہستی سامنے کھڑی اسے گھور رہی تھی۔

''تم کون ہو؟ یہاں کس طرح اور کس لیے آئے ہو؟''

''میں ایک پیاسا ہوں۔ پانی کی تلاش میں بھٹکتا ہوا ادھر آ نکلا ہوں۔ آپ کون ہیں؟ بیابان میں یہ عمارت کیسی ہے اور یہاں کیا ہو رہا ہے؟''

''میں ایک محقق ہوں اور یہ عمارت دارالتحقیقات ہے۔ یہاں موجودات کا مطالعہ ہوتا ہے۔ غیر موجودات کی کھوج کی جاتی ہے۔ اشیا کی ماہیت معلوم کی جاتی ہے۔ کائنات کے اندر ہونے والے تغیرات کے اسباب وعلل کا پتا لگایا جاتا ہے۔ اس جہانِ بے کنار میں امکانات پر غور وخوض کیا جاتا ہے۔ نئے نئے حقائق دریافت ہوتے ہیں اور ایجادات وانکشافات سے دنیا کو روشناس کیا جاتا ہے۔''

''لگتا ہے، میں مناسب مقام پر آ پہنچا ہوں، شاید اب میری مشکل آسان ہو جائے۔''

''تمھاری کیا مشکل ہے؟ کون سا پیچیدہ مسئلہ ہے جس کی عقدہ کشائی چاہتے ہو؟''

''جناب میری بس ایک ہی مشکل ہے اور وہ ہے میری پیاس، یہ پیاس!''

آواز رُک گئی اور زبان خشک ہونٹوں پر پھرنے لگی۔

''واقعی تم بہت پیاسے لگتے ہو۔ میں ابھی آیا۔'' وہ ایک میز کے پاس جا کر لوٹ آیا۔

''لو اسے چوسو! یہ آبیازہ ہے۔ اس سے تمھاری پیاس بجھ جائے گی۔'' اس نے اپنے ہاتھ کی سفید چوکور ٹکیا بے نظیر کی طرف بڑھا دی۔

''کیا سچ مچ اس سے پیاس بجھ جائے گی؟'' بے نظیر نے ٹکیا اپنے ہاتھ میں لے کر نگاہیں اس پر مرکوز کر دیں۔

''چوس کر دیکھو! تمھیں خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔''

''اچھا!'' اس نے ٹکیے کو منھ سے لگا لیا۔

''کیسا ہے؟''

''ٹھنڈا ہے۔''

''اور ذائقہ؟''

''میٹھا ہے۔''

''اچھا لگ رہا ہے؟''

''ہاں، لگ رہا ہے۔''

''یہ ہماری دریافت ہے۔.....اب سناؤ! اپنی پیاس کے متعلق تم اور کیا کہنا چاہ رہے تھے؟''

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

''پیاس! ہاں، یاد آیا............میں اپنی پیاس کے بارے میں کہہ رہا تھا۔'' ایک بڑی سی چسکی لے کراس نے نلکیے کو زبان سے الگ کرلیا۔ زبان ہونٹوں پر جمے آیاژہ کے قطروں کو چاٹنے لگی۔

''کیا کہہ رہے تھے؟''

''یہی کہ ہماری پیاس نے اس بیابان میں ایک تالاب تلاش کیا جس پر مگرمچھوں کا قبضہ تھا۔ تالاب سے پانی حاصل کرنے کے لیے ہمیں ان مگرمچھوں سے جنگ کرنی پڑی۔ اتفاق سے جنگ میں ہم جیت گئے۔ مگرمچھ تالاب سے بھاگ کھڑے ہوئے لیکن جاتے جاتے کم بخت تالاب کے پانی میں زہر گھول گئے۔ بڑی مشکل اور جاں فشانی سے ہم نے کوہِ زہر مہرہ کو کاٹ کراس کے سبز پتھروں سے زہر کے اثر کو زائل کیا۔ تشنگی مٹ جانے کے بعد ہم تالاب کی حفاظت کے لیے اپنے کچھ ساتھیوں کو وہیں چھوڑ کر اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹ گئے۔ کچھ دنوں بعد ہمیں پھر پیاس محسوس ہوئی اور ہم اپنی پیاس بجھانے واپس آئے تو تالاب کو غائب پایا۔ تالاب کی جگہ بلند و بالا چہار دیواری دیکھ کر ہماری حیرانی بڑھی اور ہم تالاب کی تلاش میں پہاڑ کی چوٹی پر جا چڑھے۔ ہماری حیرت اور بڑھ گئی جب ہم نے تالاب کو چار دیواری میں گھرا دیکھا، محافظ دستوں کو غائب پایا اور سطح آب پر پھر سے تیرتے ہوئے مگرمچھوں کی سرگوشیاں سنیں اور ان سرگوشیوں میں انسانی لہجہ محسوس کیا، تب سے ہمارے حواس حیران اور اذہان پریشان ہیں اور ہم اس بیابان کی خاک چھانتے پھر رہے ہیں۔ ہم تو ان حادثات اور تغیرات کی وجوہات سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ حضرات ان حیرت آفریں واقعات کے اسباب بتا سکیں اور تالاب کو مگرمچھوں سے آزاد کرا کر ہمیں تشنگی سے نجات دلا سکیں۔''

''تمھاری روداد بڑی حیرت انگیز اور دل چسپ ہے۔ ہم اس میں ضرور دل چسپی لینا چاہیں گے۔ تم یہیں بیٹھ کر آیاژہ چوسو، میں تمھارے اس مسئلے کو اپنے رفقا کے سامنے رکھتا ہوں۔ یقین جانو تمھارے اس عقدے کا حل ہم ضرور تلاش کریں گے۔''

وہ ہال کے وسط میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

''شوشیوشا نگ!'' اس عجیب الہیئت مخلوق کے ہونٹوں سے یہ عجیب و غریب قسم کی آواز نکل کر ہال میں گونج پڑی۔

گھڑوں جیسے سروں والے تمام بونے چونک پڑے اور اپنے اپنے کاموں کو چھوڑ کراس کے قریب جمع ہو گئے۔ سب کی آنکھیں اپنے اپنے عینکوں سے نکل کراس کے عینک میں داخل ہو گئیں۔

''بوبیوبیا نگ......... آیوآیا ژانگ.......... نونیونیا نگ.............. توتیوتا نگ........ جوجیو بُجتا نگ۔''

عجیب الخلقت مخلوق کے ان عجیب الصوت کلمات پر کھچڑیوں جیسے دھڑوں پر ٹکے تمام گھڑے ہلنے لگے۔

''سعوسعوسعانگ'' اس کی آنکھیں انھیں تکنے لگیں۔

''بوہیوبہانگ! سعوسعوسانگ۔'' ہلتے ہوئے گھڑے بج اٹھے۔

اس عجیب الہیئت مخلوق کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس کے ننھے ننھے پانو ایک میز کے پاس جا کر واپس بے نظیر کے پاس لوٹ آئے۔ دوسرے تمام محیر العقول بونے اپنی اپنی نشستوں پر پہنچ گئے۔

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

''لو، آبیاڑوں کا یہ بکس اپنے پاس رکھو اور دروازے کے پاس بیٹھ کر اطمینان سے انھیں چوستے رہو۔ ہم تمھارے مسئلے کی عقدہ کشائی میں مشغول ہونے جا رہے ہیں۔'' وہ آگے بڑھ کر ایک میز کے پاس خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی انگلیاں اور آنکھیں علم و عمل میں مصروف ہو گئیں۔

بے نظیر ہال سے نکل کر دار التحقیقات کے دروازے کے پاس آ گیا اور نتائج کے انتظار میں شب و روز گزارنے لگا۔ وقت کو پر لگتے رہے۔ پرواز بلند ہوتی گئی۔ انتظار کی ساعتوں کے درمیان اسے اکتاہٹ محسوس ہونے لگی۔ کچھ عرصے تک اس نے صبر و تحمل سے کام لیا لیکن آخر کار وہ حد بھی آ پہنچی جہاں سے آگے جانا ناممکن ہو جاتا ہے۔

اُکتا کر وہ کھڑا ہو گیا۔

اس کے قدم ہال کے اندر داخل ہو گئے۔ وہ اس عجیب الہیئت بونے کے پاس پہنچ گیا جس نے اس کی مشکل کی عقدہ کشائی کا یقین دلایا تھا۔

''کچھ معلوم ہوا؟''

''کو یوکا تگ؟'' بے نظیر کی آواز پر وہ چونک پڑا۔ اس کی نگاہیں آلات سے ہٹ کر بے نظیر کے اکتاہٹ سے بھرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

''نہیں، ابھی کچھ نہیں معلوم ہوا۔''

''وقت تو کافی لگ گیا؟''

''کام دشوار ہے، وقت تو لگے گا ہی۔''

''اتنا وقت لگ گیا اور کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا؟''

''تمھارے جس کام کا بیڑا ہم نے اٹھایا ہے، وہ اتنا مشکل ہے کہ اس کے لیے اتنا وقت کچھ بھی نہیں ہے۔ لگتا ہے تم کچھ زیادہ ہی اوب گئے ہو...... آؤ میرے ساتھ!''

''کہاں؟''

''آؤ تو، معلوم ہو جائے گا۔'' وہ اُٹھ کر دروازے کی سمت بڑھ گیا۔ بے نظیر خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑا۔ ہال کے دروازے سے نکل کر اس عجیب الہیئت مخلوق کے پانو داہنی طرف مڑ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک گنبد نما گول سے کمرے کے پاس رک گیا۔ بے نظیر بھی قریب آ گیا۔ اس نے اپنا چھوٹا سا ہاتھ سفید دیوار پر رکھ دیا۔ ہاتھ پڑتے ہی دیوار میں ایک بڑا سا شگاف بن گیا۔ اس کے قدم اندر داخل ہو گئے۔ بے نظیر کے پانو شگاف کے پاس پہنچ کر ٹھٹھک گئے۔

''گھبراؤ نہیں، بے خوف و خطر اندر آ جاؤ!''

بے نظیر کے ٹھٹھکے ہوئے پانو شگاف میں داخل ہو گئے۔ اس کے اندر پہنچتے ہی شگاف بند ہو گیا۔ دیوار پر شگاف کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

''دیوار پر ہاتھ رکھنے سے شگاف پھر ابھر آئے گا۔ آؤ اندر چلیں۔'' وہ آگے بڑھ گیا۔

بے نظیر کے پانو آہستہ آہستہ ڈرتے ہوئے آگے کھسکنے لگے۔ نگاہیں در و دیوار کے محاسبہ میں مصروف ہو گئیں۔

کشادہ کمرے میں دودھیا روشنی جھلملا رہی تھی۔ چھت اور دیواروں کا سیاہ روغن سفید روشنی میں اور بھی چمچما رہا تھا۔

سامنے کی دیوار پر ایک بڑا سا محدب شیشہ آویزاں تھا۔ شیشے کے دونوں پہلوؤں میں لکڑی کے بورڈ پر اَن گنت بٹن ٹنکے تھے۔ داہنے پہلو کے بورڈ پر بٹنوں کے اردگرد بوقلموں قمقمے جل رہے تھے جن میں سے رنگ برنگ کی روشنیاں نکل رہی تھیں۔ بائیں پہلو کے بورڈ کے نیچے ایک چکنی چمکیلی لکڑی کا بکس نصب تھا جس کے اوپری سرے سے ذرا نیچے ایک چوکور سوراخ بنا تھا اور اس سوراخ کے بالکل قریب میں ایک سرخ رنگ کا بٹن چمک رہا تھا۔

''آپ مجھے یہاں کس لیے لائے ہیں؟''

''تمھاری اکتاہٹ دور کرنے کے لیے۔''

''کیا کہا.....؟ یہاں میری اکتاہٹ دور ہو جائے گی؟''

''ہاں، یہاں تمھارے چہرے سے یہ بدرنگ لکیریں اتر جائیں گی۔ آنکھوں سے بیزاری کے بادل چھٹ جائیں گے اور دل میں بے کیفی کی جگہ کیف آگیں کیفیت محسوس ہوگی۔''

''مجھے تو نہیں لگتا کہ اس بند کمرے میں ایسا کچھ ہوگا۔''

''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟ لو، خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو!'' اس نے ہاتھ بڑھا کر شیشے کے داہنے پہلو کے بٹنوں میں سے ایک بٹن کو دبا دیا۔

بے جان دیوار میں جان پڑ گئی۔ ساکت شیشہ متحرک ہو گیا۔ خاموشی بولنے لگی۔

لفظ و معنی

وادی	–	گھاٹی، دو پہاڑوں کے درمیان کی زمین
عظیم الشان	–	بڑی شان والا
وسیع	–	چوڑا، پھیلا ہوا
عریض	–	چوڑا
ہیئت	–	بناوٹ، شکل
محیر العقول	–	عقل کو حیرانی میں ڈالنے والا، عجیب و غریب
انواع	–	نوع کی جمع، طریقے، قسمیں
حیرت افزا	–	حیرانی بڑھانے والا

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

محاسبہ - حساب، پڑتال، پوچھ گچھ

شفاف - نہایت صاف

ہیولا - تصویر کا خاکا، صورت

مشاہدہ - دیکھنا

مراقبہ - خدا کا دھیان، سوچ بچار

مستغرق - ڈوبا ہوا

ضخیم - موٹی چیز

جار - مٹی یا شیشے کا مرتبان

دخانی - دھویں یا بھاپ سے چلنے والا

مرکوز - گڑا ہوا، جمایا ہوا

جاذب - جذب کرنے والا، خشک کرنے والا، کھینچنے والا

محویت - خیال میں گم یا غرق ہونے کی کیفیت

منہمک - کام میں بے حد کوشش کرنے والا، انہماک رکھنے والا

پُشت - پیٹھ

محقق - تحقیق کرنے والا

دارالتحقیقات - تحقیق کا گھر، تحقیقی مرکز

موجودات - موجود کی جمع، مخلوقات، وہ تمام چیزیں جو خدا نے پیدا کی ہیں

ماہیت - حقیقت، کیفیت

کائنات - دنیا

تغیرات - تغیر کی جمع، تبدیلیاں

علل - عِلّت کی جمع، اسباب، وجہیں

بے کنار - جس کا کنارہ نہ ہو

غور و خوض - غور و فکر، سوچ بچار

انکشافات - انکشاف کی جمع، کھولنا، کھلنا

روشناس - واقف کار، جان پہچان والا

پیچیدہ - مشکل، لپیٹا ہوا

عقدہ کشائی - گرہ کھولنا، مشکل آسان کرنا

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

کیف آگیں - مستی سے بھرا ہوا
ہاتھ کنگن کو آرسی کیا - جو کچھ ظاہر ہے، اسے بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا
جاں فشانی - محنت، کوشش
زہر مہرہ - ایک قسم کا پتھر جو زہر جذب کر لیتا ہے
زائل - دُور ہونے والا، کم ہونے والا
تشنگی - پیاس
اذہان - ذہن کی جمع
قاصر - مجبور
روداد - کیفیت، حالت
وسط - بیچ، درمیان
صوت - آواز، صدا
شگاف - دراڑ، درار، چیرہ
محدّب - اُبھرا ہوا
آویزاں - لٹکا ہوا، معلّق
بوقلموں - رنگا رنگ
نصب - کھڑا کرنا، لگانا، قائم کرنا
کیف - نشہ، خمار

آپ نے پڑھا

□ غضنفر نے اپنے ناول 'پانی' اور بعد کے ناول 'مم' میں پانی کی تلاش، پیاس کا مداوا اور پانی کی حصولیابی کو موضوع بنایا ہے۔ ماہرین کا ماننا ہے کہ تیسری عالمی جنگ پانی کی وجہ سے ہوگی۔ دنیا میں پانی دکھائی دیتا ہے لیکن پینے کے لیے ہر آدمی کو دستیاب نہیں۔ مگر چاہیے سب کو۔ سب کی زندگی کے لیے یہ لازم ہے۔ اِسی لیے دنیا کے مختلف گوشوں میں پانی کی وجہ سے تصادم شروع ہو چکا ہے۔ خود ہمارے ملک کے متعدد صوبوں میں ندیوں کے پانی کے سبب برسوں سے تنازعات قائم ہیں۔

□ ناول میں تکنیکی نیرنگیاں اور تجربات بہت ہیں، اس لیے ان مسائل کے کئی ابعاد بھی روشن ہو جاتے ہیں۔ تالاب پر مگرمچھوں کا قبضہ ہونا استحصال کی صورتِ حال کی طرف واضح اشارہ ہے۔ اسی لیے ناول نگار کو پانی پر ظالموں کی حکمرانی تشویش ناک معلوم ہوتی ہے۔ عوام مقابلہ کر کے مگرمچھوں (ظالم قوتوں) کو دُور بھگانے میں کامیاب

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

رہے، تب بھی صاف پانی میں مگرمچھ زہر گھول گئے۔ بعد میں لوگوں کو زہریلے پانی کی صفائی کا انتظام کرنا پڑا۔ تب جا کر لوگوں کے لیے پینے کا پانی دستیاب ہو سکا۔

- لیکن تالاب کے پہرے داروں کی کوتاہی سے تالاب کو ظالم قوتوں نے اونچی چہار دیواری میں پھر قید کر لیا اور دوبارہ مگرمچھوں کا تالاب پر قبضہ ہو گیا۔
- غضنفر نے پانی کی تلاش اور اُس کے پیچ در پیچ مسائل کو جادوئی حقیقت نگاری (Magical Realism) کے انداز میں پیش کیا ہے۔ کبھی محسوس ہوتا ہے کہ کوئی آسمانی واقعہ بیان کیا جا رہا ہے اور کبھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے آس پاس کی زندگی کے مسائل و مباحث زیرِ بحث ہیں۔ دھوپ چھاؤں کی یہ تکنیک موجودہ سبق کے آغاز سے انجام تک دیکھنے کو ملے گی جس سے تجسس میں اضافہ ہوتا ہے۔
- غضنفر نے ''آبیاژہ'' شے کی ایجاد کر کے پیاس سے نجات حاصل کرنے کا جو نسخہ سُجھایا ہے، اس کی طنزیہ جہت سے مسئلے کی سنگینی کا پتا چلتا ہے۔ یہ بھی خوب ہے کہ لوگوں کو پانی تو نہیں دیا جائے لیکن پیاس کے بدلے ایک چاکلیٹ سے کام چلا لینے کی صلاح دی جائے۔ دواؤں اور قیمتی دواؤں کی مار سے پریشان عوام سے ہمیشہ کے لیے پانی کو الگ کر دیا جائے۔
- غضنفر نے داستانی، افسانوی اور جادوئی تمام سلسلوں کو اس ناول میں آزمایا ہے لیکن ان کا مقصد واضح ہے کہ وہ انسانیت کو اس کے فطری حقوق سے دست بردار کیے جانے کی مخالفت کرتے رہیں گے۔ ہوا، دھوپ، پانی اور زمین آدمی کو چاہیے اور یہ سب اس کے فطری حقوق ہیں، انھیں غصب کرنے والے ظالم ہیں جن سے ہمیں بہر طور مقابلہ آرا ہونا ہے۔

آپ بتائیے

1- ناول ''پانی'' کے تخلیق کار کا نام بتائیے۔
2- مصنف کب پیدا ہوئے؟
3- غضنفر کا تعلق کس صوبے سے ہے؟
4- دارالتحقیقات کے معنی بتائیے۔
5- بے نظیر کس شے کی تلاش میں پریشان تھا؟
6- ''آبیاژہ'' کیا ہے اور اس کے کون سے فائدے ہیں؟
7- کہاں کے لوگوں نے ''آبیاژہ'' دریافت کیا؟
8- ''آبیاژہ'' کیسا تھا اور اس کا ذائقہ کیسا تھا؟
9- تالاب کے پانی میں زہر کس نے گھولا؟
10- زہر کے اثر کو کس چیز سے زائل کیا گیا؟

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

11- ''کوکیوکاکانگ'' کس کا نام تھا؟
12- غضنفر کے تین ناولوں کے نام بتائیے۔

☐ دیے گئے جمع الفاظ کے واحد بنائیے۔

تغیرات　اسباب　علل　انکشافات　ایجادات　امکانات

تحقیقات　موجودات　مشکلات　حادثات　حضرات

مختصر گفتگو

1- غضنفر نے پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کس حیثیت سے کیا اور اب وہ کس عہدے پر فائز ہیں؟
2- اپنی ادبی زندگی کا آغاز غضنفر نے کس صنف سے کیا؟ کیا آج اُن کی شہرت کسی دوسری صنف کی وجہ سے ہے؟
3- بے نظیر اور اس کے ساتھیوں کو تالاب سے پانی حاصل کرنے کے لیے کیوں جنگ کرنی پڑی؟
4- تالاب کے غائب ہو جانے کا واقعہ اپنے الفاظ میں قلم بند کیجیے۔
5- ''شوشیوشاشانگ'' اس آواز سے بونوں پر کیا اثر پڑا؟
6- بے نظیر کی اکتاہٹ دور کرنے کے لیے بونے اُسے کہاں لے گئے؟

تفصیلی گفتگو

1- غضنفر فکشن کی جانب کب متوجہ ہوئے اور اس کے بعد ان کی ادبی سرگرمیاں کیسی رہیں؟
2- غضنفر کے دو ہم عصر ناول نگاروں کے نام بتائیے اور ان کے ایک ایک مشہور ناول کا تعارف پیش کیجیے۔
3- غضنفر کی ادبی سرگرمیوں کا تعارف دو سو الفاظ میں کرائیے۔
4- عمارت دار التحقیقات میں بے نظیر نے کیا کیا دیکھا؟ تفصیل سے لکھیے۔
5- ''آبیاژہ'' کی تحقیق سے کیا ریگستانوں کا معاملہ حل ہو سکتا ہے؟ آبیاژہ اور پیاسے افراد کے بارے میں بتائیے۔

آیئے، کچھ کریں

1- غضنفر کے ناول ''پانی'' کی کاپی اپنی لائبریری میں تلاش کیجیے اور اسے پورا پڑھ جائیے۔
2- ''پانی'' کے ساتھ دو اور ناول ''دوگز زمین'' اور ''مکان'' بھی منظر عام پر آئے۔ آپ ان دونوں ناولوں کو پڑھ کر ''پانی'' سے موازنہ کریں۔ ان میں آپ کو کون سا ناول پسند آیا، اس کی وجوہات ایک چارٹ پر درج کر کے اپنے استاد کو دکھائیے۔

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

ڈراما

دنیا کے قدیم ادب کے ابتدائی نمونے شعری ڈرامے کی شکل میں ملتے ہیں۔ یونانی اور سنسکرت ادب میں تخلیق وتنقید کی تمام ابتدائی روایتیں ڈرامے سے ہی متعلق رہی ہیں لیکن اردو میں ڈراما نگاری کی کسی قدیم روایت کا سُراغ اب تک نہیں مل سکا۔ اردو میں ڈراما نگاری عہدِ جدید کی دین ہے۔ اردو میں ڈرامے کی ابتدا کا سہرا اودھ کے نوابوں کے سر ہے جہاں تہذیبی اور معاشرتی زوال کی ایک دل چسپ جلوہ گری ادبی تخلیقات کے آئینے میں ملتی ہے۔ شجاع الدولہ کی ادب وثقافت سے محبت نے دلّی کے مقابلے میں لکھنؤ کو شعروادب کا مرکز بننے میں جو سہولت عطا کی؛ اسی کا عروج آخری نواب واجد علی شاہ اختر کی شخصیت میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ واجد علی شاہ نے رام لیلا کے بجائے کرشن لیلا کی طرف توجہ کی اور ناٹک، نوٹنکی اور سوانگ کی ایک ملی جلی شکل ''رہس'' کی ایجاد کی۔ واجد علی شاہ ان ''رہسوں'' میں خود بھی رقص اور اداکاری کرتے تھے۔ 1843ء میں رہس ''رادھا کنھیا'' کے اسٹیج ہونے کی بات سامنے آتی ہے۔ حالاں کہ اس ڈرامے کا جو پہلا نسخہ دستیاب ہے، وہ 1861ء کا ہے۔

واجد علی شاہ کے رہس شاہی اسٹیج پر ہوا کرتے تھے جہاں عام لوگوں کا گزر ممکن نہیں تھا۔ شاہی اسٹیج کی فضیلت اور اہمیت اپنی جگہ لیکن شعروادب کی حقیقی روایتیں عوامی منچ پر ہی پروان چڑھتی ہیں۔ لکھنؤ کے اہلِ قلم اور ڈرامے کے شائقین کے لیے سیّد آغا حسین امانت لکھنوی نے ''اندر سبھا'' کی داغ بیل رکھ کر اسٹیج کو عوام تک پہنچا دیا۔ مرزا امانت نے 1853ء میں اسے پہلی بار اسٹیج کر لیا تھا۔ لکھنؤ میں شاہی اسٹیج اور اندر سبھاؤں کے عروج پر پہنچنے کے ساتھ ہی دیگر موضوعات پر مشتمل ڈرامے بھی آزادانہ طور پر لکھے جانے لگے۔ ایسے ڈراموں کی بہترین مثال کیشو رام بھٹ کے تین ڈرامے ہیں: ''سجاد و سنبل''، ''اندھوں کو آنکھ'' اور ''شمشاد و سوسن''۔

انیسویں صدی میں ہی بہار کے علاوہ بنگال اور بمبئی کی طرف اردو ڈرامے کا کارواں بڑھا۔ اس بیچ بڑے پیمانے پر تھیٹریکل کمپنیاں قائم ہوئیں اور بعض کلب بھی ڈرامے کے لیے وقف ہو گئے۔ اس دور میں پروفیشنل طریقے سے پارسیوں نے ڈرامے کی طرف دھیان دیا۔ انیسویں صدی کے آخری بیس پچیس برسوں میں جو چند مشہور ڈرامے اسٹیج کیے گئے اور جن کی ادبی قدر و قیمت آج بھی قائم ہے، وہ ہیں: بے نظیر بدر منیر (رونق بنارسی)، نگاہِ غفلت (طالب بنارسی)، مرقعِ لیلیٰ مجنوں (مرزا ہادی رسوا)، طلسماتِ سلیمانی (بزرگ لاہوری) وغیرہ۔

اردو ڈرامے کے اسی موڑ پر آغا حشر کاشمیری کا ورودِ مسعود ہوتا ہے۔ آغا حشر کاشمیری بیسویں صدی کے

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

صاحب طرز لکھنے والوں میں شامل ہیں۔ اردو ڈرامے کی تاریخ جب کسی ایک نام کی تلاش میں نکلتی ہے تو وہ آغا حشر کے علاوہ کوئی دوسری شخصیت نہیں ہوتی۔ اُن کا مشہور ڈراما ''سلور کنگ'' 1910ء میں لکھا گیا تھا۔ آغا حشر نے لاہور میں ''انڈین شیکسپیر تھیٹریکل کمپنی'' بنائی اور ''یہودی کی لڑکی'' ڈراما لکھا جس سے اُن کی شہرت میں اضافہ ہوا۔ 1930ء میں ''رستم وسہراب'' ڈراما تحریر ہوا۔ 1896ء سے 1935ء کے بیچ یکے بعد دیگرے ان کے 33 ڈرامے اور چھے فلمیں سامنے آئیں۔ اُن کے ایک ایک ڈرامے سینکڑوں بار اسٹیج ہوئے۔

جب آغا حشر کی شہرت آفتاب نصف النہار کی طرح تھی، ایک ایسا ڈراما لکھا جاتا ہے جس نے اردو ڈرامے کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کر دیا۔ 1922ء میں لاہور کے ایک بائیس برس کے نوجوان امتیاز علی تاج نے ''انارکلی'' نام سے ایک ڈراما لکھا جس کی اشاعت کوئی دس برسوں کے بعد ہوئی۔ تاج نے خود اُسے اسٹیج بھی کیا۔ ایک ایسی کہانی جس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہو لیکن عام لوگوں کے درمیان اس کی مقبولیت سچے واقعے کی طرح قائم ہو، ''انارکلی'' کی یہی طاقت ہے۔ مکالمات، تصادم، کردار نگاری، کشمکش اور تجسس، گیت اور سنگیت، ڈرامائیت اور موضوع کے اعتبار سے بے مثل اسلوب، کون سا ایسا جزو ہے جسے ''انارکلی'' میں ڈراما نگار نے بلندی تک نہیں پہنچایا؟

آغا حشر اور امتیاز علی تاج کے بعد ڈراما نگاروں میں حبیب تنویر، سیّد عابد حسین اور محمد مجیب کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ اسی زمانے میں اردو کے دیگر ادیب اور شاعروں نے بھی ڈراموں کی طرف توجہ کی۔ سعادت حسن منٹو (آؤ)، راجندر سنگھ بیدی، (سات کھیل)، ابراہیم جلیس (اجالے سے پہلے)، رشید جہاں (بچوں کا خون)، عصمت چغتائی (دھانی بانکیں) کو اردو ڈرامے کی تاریخ میں بھلایا نہیں جا سکتا۔ آزادی کے بعد ابھرنے والے ڈراما نگاروں میں ڈاکٹر محمد حسن، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، شمیم حنفی، کمال احمد اور ظہیر انور کی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ڈراما اور اسٹیج لازم و ملزوم ہیں، اسی لیے ڈرامے کے عناصرِ ترکیبی میں اسٹیج کی ضرورتوں کو شامل تصوّر کیا گیا۔ قصہ اور پلاٹ کے ساتھ مکالمے، کردار، تجسس، تصادم، نقطۂ عروج اور انجام کو اس صنف میں زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کرداروں کے درمیان جس قدر ٹکراو کے مواقع آئیں گے، اسی قدر فنی استحکام کی صورت پیدا ہوگی۔ ڈراما اُسی وقت کامیاب المیہ بن سکتا ہے جب تصادم انتہائی حالت میں ہو۔

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

امتیاز علی تاج

سیّد امتیاز علی تاج 1900ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شمس العلما مولوی سیّد ممتاز علی، سرسیّد کے دوست تھے۔ انھیں عربی، فارسی اور انگریزی میں دست گاہ حاصل تھی۔ یہ جدید تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ عورتوں کی تعلیم اور اصلاح کے لیے انھوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ان کا رسالہ ''تہذیبِ نسواں'' عورتوں میں بہت مقبول تھا جو نصف صدی تک نکلتا رہا۔ تاج کی والدہ محمدی بیگم بھی پڑھی لکھی روشن خیال خاتون تھیں اور اپنے شوہر کی تعلیمی سرگرمیوں میں ہاتھ بٹاتی تھیں۔ جو والدین ملک وقوم کی ذہنی تربیت میں مصروف رہیں، وہ اپنے بچّے کی اچھی تربیت سے کیسے غافل رہ سکتے تھے۔ امتیاز علی تاج کے ذہن ودل پر گھر کے علمی ماحول کا نہایت خوش گوار اثر مرتّب ہوا۔ اُنھوں نے کم عمری سے ہی لکھنا شروع کیا۔ بچّوں کے مشہور ہفتہ وار اخبار ''پھول'' سے ان کے لکھنے کا آغاز ہوا جس نے ان کے ادبی مزاج کی تشکیل وتہذیب میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کا صحافتی شعور اس قدر پختہ ہو چکا تھا کہ اپنی طالب علمی کے دوران ہی انھوں نے لاہور سے ''کہکشاں'' کا اجرا کیا۔ والد کے انتقال کے بعد انھوں نے ''تہذیبِ نسواں'' اور ''پھول'' کی ذمّے داری بھی خوش اسلوبی سے نبھائی۔

1958ء میں وہ مجلسِ ترقّیِ ادب، لاہور کے ڈائرکٹر ہوئے۔ وہ دارالاشاعت پنجاب کے علمی وادبی امور کے مشیر اور نگراں بھی تھے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں انھیں ''ستارۂ امتیاز'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ 19 اپریل 1970ء میں ان پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ وہ زخموں کی تاب نہ لا سکے اور ان کا وصال ہو گیا۔

امتیاز علی تاج نے شاعری کی اور بچوں کے لیے بہت سی کہانیاں لکھیں لیکن اردو میں انھیں شہرت ''چچا چھکّن'' اور ''انارکلی'' کی وجہ سے ملی۔ جیروم کی کتاب ''تھری مین اِن اے بوٹ'' کے ایک کردار انکل پوجر کو بنیاد بنا کر انھوں نے چچا چھکّن کا کردار تراشا اور اسے اردو کا مقبول ترین مزاحیہ کردار بنا دیا۔ اسی طرح ''انارکلی'' کی داستانِ محبت لکھ کر بہ حیثیتِ ڈراما نگار بقائے دوام کے دربار میں جگہ حاصل کر لی۔ یہ ڈراما زبان وبیان اور پُر زور مکالموں کے اعتبار سے خاصا اہم ہے۔ آج بھی اس کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

انارکلی

(منظرِ سوم)

افراد

جلال الدین محمد اکبر	شہنشاہِ ہند
سلیم	اکبر کا بیٹا اور ولیِ عہد
بختیار	سلیم کا بے تکلف دوست
رانی	اکبر کی راجپوت بیوی اور سلیم کی ماں
انارکلی	حرم سرا میں اکبر کی منظورِ نظر کنیز
ثریّا	انارکلی کی چھوٹی بہن
انارکلی کی ماں	
دِل آرام	انارکلی سے پہلے اکبر کی منظورِ نظر کنیز
زعفران	حرم سرا کی ایک شوخ کنیز
ستارہ	حرم سرا کی کنیز، زعفران کی سہیلی
مروارید	حرم سرا کی کنیز، دل آرام کی رازدار
عنبر	حرم سرا کی کنیز، دل آرام کی رازدار
خواجہ سرا کافور	کنیزوں کا داروغہ

مقام	قلعۂ لاہور
زمانہ	1599ء کا موسمِ بہار

اکبر کی خواب گاہ۔ اُسی رات میں اور تقریباً اسی وقت۔

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

ایک مختصر مگر تکلف سے آراستہ حجرہ جس کی چھت ماہی پشت انداز کی ہے۔ دیواروں کا بیش تر حصہ قرامزی مخمل کے بھاری بھاری پردوں سے جن پر سیاہ ریشم کے نقش بنے ہیں، چھپا ہوا ہے۔ صرف سامنے کی دیوار کے درمیانی حصے پر سے پردے سرکے ہوئے ہیں، جہاں ایک خوش وضع جالی دار محراب ہے۔ محراب کے جھروکے میں سے نیلے آسمان پر چند تارے ٹمٹماتے نظر آرہے ہیں۔

ایرانی قالینوں کے فرش پر دائیں کونے میں سونے کے بھاری بھاری جڑاؤ پایوں کا ایک پلنگ بچھا ہے جس پر تانبے کے رنگ کا پلنگ پوش پڑا ہے۔ سرہانے ایک ہشت پہلو میز پر تلوار اور دوشاخہ رکھا ہے۔ بائیں طرف ایک بیش قیمت تخت پر زری کے کام کی مسند بچھی ہے اور اُس پر تکیے رکھے ہیں۔ دائیں بائیں دیوار کے ساتھ نیچی چوکیوں پر پھول دانوں میں رتن مالا اور کرن پھول کی رنگینیوں میں سے پاڈل، نواری اور نرگس کے پھول اُبھر ابھر کر عطر بیز ہیں۔ کمرے کے درمیان میں اکبر ایک کشمیری فرغل پہنے، ہاتھ ایک ہشت پہلو میز پر ٹکائے کھڑا سامنے گھور رہا ہے۔ پیچھے تخت پر رانی بیٹھی ہے۔

رانی: مہاراج رحم کیجیے۔ پہلے میری التجا تھی، اس کو چھوڑ دیجیے۔ اب میری فرمائش ہے انارکلی کو سلیم کے لیے چھوڑ دیجیے۔

اکبر: انارکلی کو سلیم کے لیے؟ یہ تم کہہ رہی ہو رانی؟

رانی: سب کچھ سوچ کر، سب کچھ سمجھ کر، سب پہلوؤں پر غور کر کے....

اکبر: تمھارا مشورہ ہے کہ میں اپنی زندگی کے تمام خواب چکنا چور کر ڈالوں؟ وہ خواب جو میرے دنوں کا پسینہ، میری راتوں کی نیند، میری رگوں کا لہو، میری ہڈیوں کا مغز ہیں۔ تمھارا مشورہ ہے کہ میں ان سب کو چکنا چور کر ڈالوں؟

رانی: (کچھ کہنا چاہتی ہے مگر نہیں کہتی، سر جھکا لیتی ہے) اولاد کے لیے کیا کچھ نہیں کیا جاتا؟

اکبر: (دبے ہوئے جوش سے) کیا کچھ نہ کیا گیا؟

رانی: (سر جھکائے ہوئے) پھر اب بھی ہم کیوں نہ صرف ماں اور باپ کا حق ادا کریں!

اکبر: اور کب تک اُس سے اولاد کے فرض کی اُمید نہ رکھیں؟

رانی: (سر اُٹھا کر) کیوں اُمید رکھیں؟ ہمیں تو تھے جو اولاد کی آرزو میں سایے کی طرح اُداس پھرا کرتے تھے۔ ہمیں تو تھے جو اولاد پا کر دونوں جہاں حاصل کر بیٹھے تھے اور ہمارے ہی لیے تو اس کا ایک تبسم زندگی کے تمام زخموں پر مرہم تھا۔ ہم تو صرف اس لیے اُس کی تمنا کرتے تھے کہ اس سے ہمارا ویران دل آباد ہو اور ہم اپنی موت کے بعد بھی اُس میں زندہ رہ سکیں۔ پھر اُس سے توقع کیسی؟

اکبر: تم ماں ہو، صرف ماں۔

رانی: (جل کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ضبط کی کوشش کرتی ہے مگر نہیں رہا جاتا۔ پھٹ پڑتی ہے۔) میں خوش ہوں کہ میں صرف ماں ہوں اور مجھ کو رنج ہے کہ آپ شہنشاہ ہیں، صرف شہنشاہ۔

اکبر: (منھ موڑتے ہوئے) ہم اُسے محبت کی غیر ضروری نرمی سے بگاڑنا نہیں چاہتے۔

رانی: (چڑ کر) سختی ایک نوجوان اور جوشیلی طبیعت کو سنوار نہیں سکتی۔

اکبر: (سر ہلاتا ہوا میز کے دوسری طرف چلا جاتا ہے) لیکن اُسے سنورنا ہی ہوگا۔ سنورے بغیر اس کا قدم ہندستان کے

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

تخت کو نہیں چھو سکتا۔

رانی: وہ آپ کے ہندستان کے تخت کو جہنم سمجھتا ہے۔ جہاں انارکلی ہو، وہ جگہ اُس کے لیے جنت ہے۔

اکبر: (مڑ کر رانی کو دیکھتا ہے) یہاں تک؟

رانی: اس کی رگوں میں خون جوانی کے گیت گا رہا ہے اور جوانی کی نظروں میں ہندستان ایک عورت سے زیادہ قیمت نہیں رکھتا۔

اکبر: (رانی کو تکتے ہوئے) ہندستان ایک عورت سے سستا ہے؟

رانی: وہ یہی کہتا ہے۔

اکبر: خود سلیم؟

رانی: خود سلیم۔

اکبر: (سامنے مڑ کر ہاتھ پیشانی پر رکھ لیتا ہے) آہ میرے خواب! وہ ایک عورت کے عشووں سے بھی ارزاں تھے! فاتح ہند کی قسمت میں ایک کنیز سے شکست کھانا لکھا تھا!

رانی: (سر جھکا کر خاموش ہو جاتی ہے۔ ذرا دیر بعد سر اُٹھا کر) جو ہو چکا بدل نہیں سکتا۔ جو آنے والا ہے، اُسے سدھارئیے۔

اکبر: (مایوسی کے قلق اور غصّے سے) اور کیا آئے گا؟ میرے دل کو اُجاڑ دینے کے بعد وہ میرے جسم کو بھی ویران کر ڈالنے کا آرزومند ہے؟

رانی: کیا کہتے ہیں مہاراج! یہ سوچنے سے پہلے وہ اپنی جان گنوا ڈالے گا۔

اکبر: (غم سے سر جھکا کر) اس کے وہی معنی ہیں۔ ہم، ہماری آرزوئیں، ہماری راحت، ہماری زیست، سب اُس کے لیے بے معنی لفظ ہیں۔ اُس کا سب کچھ انارکلی ہے۔ اس کے دل میں ماں باپ کی یہ قدر ہے؟

رانی: اُس کے دل میں اپنی محبت کا اندازہ اس کی موجودہ حالت سے نہ لگائیے۔ یہ جنون آرام سے گزر جانے دیجیے۔ پھر دیکھیے سلیم کیا بن جاتا ہے۔

اکبر: (رانی کو تکتے ہوئے) اور یہ جنون کس طرح گزرے گا؟

رانی: چڑھا ہوا دریا بند لگانے سے نہ رُکے گا۔ اُسے انارکلی کو لے لینے دیجیے۔ وہ اسے اپنی بیگم بنا لے۔ انارکلی کا ہو کر وہ ہمارا سلیم بن جائے گا۔

اکبر: (کچھ دیر سامنے دیکھتا رہتا ہے) اُسے اپنا بنانے کے لیے میں ایک کنیز کا ممنونِ احسان نہیں بننا چاہتا۔ (توقف کے بعد) جو کچھ وہ چاہتا ہے، اسے کرنے دو اور جو کچھ میں چاہوں گا، میں کروں گا۔

رانی: (مایوس ہو کر چلتی ہے اور پلنگ کے قریب پہنچ کر رک جاتی ہے) میں پھر کہوں گی آپ شہنشاہ ہیں، صرف شہنشاہ۔

اکبر: (خاموش ہونے کو ہاتھ اُٹھا کر) ہم اور کچھ نہیں سننا چاہتے۔ ہم سوچیں گے اور کل صبح انارکلی کا فیصلہ.....

(انارکلی کی ماں دیوانہ وار اندر گھس آتی ہے)

ماں: انارکلی کا فیصلہ! میری غریب بچّی کا فیصلہ! اُسے بخش دیں ظلِ الٰہی! اے شہنشاہ! اے غریبوں کی قسمت کے والی!

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

اکبر: (حیرت اور غصے سے) بغیر اجازت یہاں آنے کی جرأت!

ماں: (دوزانو ہوکر) بندے خدا کے حضور میں بغیر اجازت جاسکتے ہیں اور تو خدا کا سایہ ہے۔ مہربان شہنشاہ ہے، اور وہ میری بچی ہے۔ میری زندگی کی آس ہے۔ خطاوار ہے مگر تو رحیم ہے۔ وہ گنہ گار ہے مگر تو رحیم ہے۔ بخش دے۔ للّٰہ اس کو بخش دے۔

اکبر: جاؤ اور فیصلے کا انتظار کرو۔

ماں: میں کہاں جاؤں؟ شہنشاہ! مجھ کو کہیں قرار نہیں (اُٹھ کر رانی کے پانو پکڑ لیتی ہے) بچے کی ماں ہو۔ ان ٹیسوں کو جانتی ہو۔ میں تمھارے پیروں کو چومتی ہوں۔ کہہ دو مجھے مار ڈالیں۔ میں دنیا سے سیر ہو چکی۔ میرے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں۔ مگر اس ناشاد نے دنیا کا کچھ نہیں دیکھا۔ اُسے بخش دیں۔

اکبر: (دروازے کی طرف رُخ کر کے) اسے لے جاؤ۔

(خواجہ سرا داخل ہو کر اُسے اٹھاتے ہیں)

ماں: میں یہیں جم کر رہ جاؤں گی۔ یہیں ہوش حواس کھو بیٹھوں گی۔ مجھے ہاتھ پھیلا لینے دو۔ خون کو خون کے لیے التجا کر لینے دو۔ شاید وہ بچ جائے۔ میری جان۔ میرے جگر کا ٹکڑا۔ میری نادرہ! (خواجہ سرا لے جانے کو کھینچتے ہیں)۔ رانی تم بولو! شہنشاہ ایک رحم کی نظر ڈالو! یہ بُڈھیا جی اٹھے گی۔

(اکبر سر جھکائے خاموش کھڑا رہتا ہے)

ظالمو! نہ کھینچو۔ رحم! رحم! الٰہی! تو ہی سُن۔ ظلِ الٰہی تو نہیں سنتا۔ اے آسمان! تو ہی مدد دے! رانی مدد نہیں کرتی۔ اُن کے دلوں کو نرم بنا کہ انھیں میرا دُکھ معلوم ہو سکے۔

(اکبر بے قراری سے سر ہلاتا ہے۔ خواجہ سرا انارکلی کی ماں کو زور سے کھینچتے ہیں) ہائے! مجھے یوں نامراد نہ لے جاؤ۔ میں یہاں سے نکلتے ہی دم توڑ دوں گی۔ یہ منصف آسمان گر پڑے گا۔ اس ظلم کا، اس قہر کا انتقام لے گا۔ (خواجہ سرا چیختی چلاتی انارکلی کی ماں کو زبردستی لے جاتے ہیں۔ پیچھے پیچھے رانی آنسو پونچھتی ہوئی خاموش چلی جاتی ہے)

اکبر: (توقف کے بعد سر آسمان کی طرف اُٹھا کر) نامراد باپ اور مایوس شہنشاہ۔ یوں تیرے خواب تمام ہوئے (آنکھیں بند کر کے سر جھکا لیتا ہے) دنیا سے، واقعات سے اور تقدیر تک سے لڑنے کے بعد کون جانتا تھا، تجھ کو یہ دردانگیز مرحلہ طے کرنا پڑے گا۔ (گہری آہ بھر کر) جس کے لیے خود سب کچھ کیا تھا، اس سے، اپنی اولاد سے، اپنے شیخو سے الجھنا ہوگا (توقف کے بعد بے قراری سے) یاس! یاس! ہندستان کیوں اور جہاں بانی کی آرزو کیوں (سوچتے ہوئے ملول نظروں سے) اُس کے لیے جس نے ایک حسینہ کی آنکھوں پر باپ کو فروخت کر ڈالا۔ اس کو باپ نہیں چاہیے۔ باپ کی محبت نہیں چاہیے۔ باپ کا ہندستان نہیں چاہیے۔ وہ صرف انارکلی کو لے گا۔ ایک کنیز کو جو اُسے انداز دکھائے۔ اس کے سامنے ناچے اور اس سے اشارے کنائے کرے (ہاتھ پیشانی پر رکھ لیتا ہے) آہ میرے خواب! میرے خواب!

(انتہائی مایوسی کے عالم میں مُڑ کر تخت تک پہنچتا ہے اور اس کے قریب خاموش کھڑا ہو جاتا ہے) کل رات وہ اپنی

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

جنت میں تھا۔ اگر دل آرام نہ دکھاتی۔ کہاں ہے وہ؟ وہ ضرور کچھ زیادہ جانتی ہوگی۔ (مرکر تالی بجاتا ہے)

(خواجہ سرا داخل ہوتا ہے)

اکبر: دل آرام!

(خواجہ سرا اُلٹے پانو واپس جاتا ہے)

(تخت پر بیٹھ کر) میرے ہی بیٹے کی محبت اگر ایک کنیز چاہے تو مجھ کو بخش سکتی ہے۔ آہ شیخو! تم اکبر کی کنیز کو اکبر ہی کے سینے پر نچانا چاہتے ہو؟

(انتہائی صدمہ کے مارے سر جھکا لیتا ہے)

(دل آرام داخل ہو کر مجرا بجالاتی ہے)

(کچھ دیر چپکا اُسے دیکھتا رہتا ہے) لڑکی! تجھے شیخو اور انارکلی کے کیا تعلقات معلوم ہیں؟

دل آرام: (سراسیمگی سے) ظلِ الٰہی! کچھ نہیں۔

اکبر: جواب دینے سے پہلے سوچ۔

دل آرام: میں نے سچ کہہ دیا۔

اکبر: (پُر معنی انداز میں) تو نے سچ نہ کہا تو تجھ سے سچ کہلوایا جائے گا۔

دل آرام: (سہم کر) ظلِ الٰہی! ظلِ الٰہی!

اکبر: ایک لفظ نہیں، جو کچھ ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں اُس کے سوا ایک لفظ نہیں۔

دل آرام: (بڑھ کر دو زانو ہو جاتی ہے۔ لجاجت سے) میں کچھ نہیں جانتی۔

اکبر: (دل آرام کی گردن دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر) کمینی جھوٹ! تو نے دکھایا۔ صرف تو دیکھ سکی۔ تمام جشن میں سے صرف تو جو اُس وقت ہمارے حضور میں موجود تھی۔ جو سب سے زیادہ مصروف تھی۔ تو جانتی تھی۔ تجھے اس کی توقع تھی۔ کہنا ہوگا دل آرام! سب کچھ جو تو جانتی ہے ورنہ کہلوایا جائے گا۔

دل آرام: مجھے بخش دیجیے۔ مجھے بخش دیجیے۔

اکبر: تیرا دوسرا غیر ضروری لفظ پوچھنے کے ذرائع تبدیل کر دے گا۔

دل آرام: (سہمی ہوئی آواز میں) وہ مجھے برباد کر ڈالیں گے۔ ظلِ الٰہی کے عتاب میں لے آئیں گے۔

اکبر: کون؟

دل آرام: (اِدھر اُدھر دیکھ کر) صاحبِ عالم!

اکبر: شیخو؟ وہ جرأت نہیں کر سکتا۔

دل آرام: (اکبر کے پیروں کو ہاتھ لگا کر) اُن کی دھمکی خوف ناک تھی۔ افشائے راز کی سزا موت سے بھی زیادہ ہولناک تھی۔

اکبر: کیا؟

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

دل آرام: مجھ پر وہ جھوٹا الزام لگایا جائے گا جو واقعات نے انارکلی پر لگایا۔

اکبر: کہ تو سلیم کو چاہتی ہے۔

دل آرام: اور محبت کی مایوسی نے مجھے یوں انتقام لینے پر آمادہ کیا۔

اکبر: تو ہمارے سایۂ عاطفت میں ہے۔ بول!

دل آرام: (کھڑی ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتی ہے) وہ رات کو باغ میں ملتے تھے اور اُن کی ملاقاتیں خطرناک ارادوں سے بھری ہوتی تھیں۔

اکبر: (دل آرام کو تکتے ہوئے) وہ ارادے؟

دل آرام: (لجاجت سے) مجھے جرأت نہیں پڑتی۔

اکبر: (کڑک کر) کہے جا!

دل آرام: (تامل کے بعد) وہ ظلِ الٰہی کے دشمنوں پر آنچ لانے اور ہندستان کے تخت پر قبضہ پانے کی تجویزیں کیا کرتے تھے۔

اکبر: (دل آرام پر یوں نظریں گاڑ کر گویا سب کچھ اُس کے جواب پر منحصر ہے) شیخو بھی؟

دل آرام: انارکلی صاحبِ عالم کو اس پر آمادہ کرتی تھی۔

اکبر: (گرج کر) تو، جھوٹ بول رہی ہے، جھوٹ۔

دل آرام: (پیروں پر گر کر) ظلِ الٰہی کے حضور میں زبان سے جھوٹ نہیں نکل سکتا۔

اکبر: اُس سے انارکلی نے کہا —؟

دل آرام: ایک طرف باپ ہے اور دوسری طرف محبوب۔ دونوں میں سے جو پسند ہو چُن لو۔

اکبر: (بالوں سے پکڑ کر دل آرام کا منھ اوپر کرتا ہے) اور شیخو نے دونوں میں سے محبوب کو پسند کیا؟

دل آرام: وہ کھوئے سے گئے، مگر انارکلی رو پڑی۔ وہ اُٹھے اور ان کا ہاتھ تلوار پر گیا۔ انھوں نے انارکلی کے کان میں کچھ کہا اور وہ مسکرانے لگی۔

اکبر: (اکبر دل آرام کو چھوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایذا کے احساس سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اس کا بدن آگے پیچھے یوں گھوم رہا ہے گویا پیروں میں جسم کو سنبھالنے کی تاب نہیں رہی۔ آخر لڑکھڑا کر تخت پر بیٹھ جاتا ہے)

دل آرام: میں چھپ کر سُن رہی تھی تو صاحبِ عالم کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ یہ سمجھ کر کہ میں یہ گفتگو بارگاہِ عالی تک پہنچا دوں گی، انھوں نے مجھ کو دھمکی دی کہ انارکلی کا نام زبان سے نکالنے پر تجھ کو پچھتانا ہوگا۔ مہابلی کے سامنے جھوٹی شہادت پیش کی جائے گی کہ تو خود ہم کو چاہتی ہے اور جب ہم نے تجھ کو مایوس کر دیا تو تو نے اپنی ناکامی کا انتقام لینے کو یہ ڈھنگ نکالا۔ میں سہم گئی۔ میری زبان بند ہو گئی۔ مجھے جہاں پناہ کے حضور میں ایک لفظ زبان سے نکالنے کی جرأت نہ ہوئی۔ لیکن میں اس فکر میں گھلتی رہی۔ ایسے موقعے کی تاک میں رہی جہاں میری زبان بند رہے اور شہنشاہ کی نظریں دیکھ سکیں۔

اکبر: (صدمے کے مارے یوں سُن سا بیٹھا ہوا ہے گویا اس بھری دنیا میں اکیلا اور تہی دست رہ گیا ہے۔ آہستہ سے) بس کر! بس کر۔

دل آرام: (ملال سے) صاحبِ عالم بے قصور ہیں، معصوم ہیں۔ وہ پھسلا لیے گئے۔ بہکا لیے گئے۔ (خواجہ سرا آتا ہے)

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

خواجہ سرا: مہابلی! داروغۂ زنداں شرفِ باریابی چاہتا ہے۔

اکبر: کون؟

خواجہ سرا: داروغہ جو زنداں میں انارکلی کا محافظ ہے۔

اکبر: (منھ دوسری طرف کر کے) ہر زبان پر یہی نام میری تضحیک کر رہا ہے (توقف کے بعد خواجہ سرا سے) اس وقت کیا چاہتا ہے؟

خواجہ سرا: اُسے کچھ بے حد ضروری کام ہے۔

اکبر: (ذرا دیر خاموش رہ کر) بلاؤ!

(خواجہ سرا اُلٹے پاؤں واپس جاتا ہے)

(توقف)

دل آرام: (لجاجت سے) مہابلی! لونڈی کو معاف کرنا۔ میرے الفاظ نے سماعت عالی کو صدمہ پہنچایا۔ مگر میں پھر کیا کرتی؟ کس طرح ظل الٰہی کی جان کو خطرے میں دیکھتی اور چپ رہتی؟

اکبر: (یکا یک بیتاب ہو کر) کمینی! دور ہو جا!

(دل آرام مجرا بجالا کر چلی جاتی ہے)

(اکبر خاموش اور ساکت بیٹھا رہتا ہے، مگر اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں) میرے دماغ میں شعلے بھڑک رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا میں کیا کر بیٹھوں گا۔ مگر وہ اس صدمے کی طرح مہیب ہوگا۔ (داروغۂ زنداں داخل ہو کر مجرا بجالاتا ہے۔ اُس کا سانس پھول رہا ہے اور وہ منتظر ہے کہ اکبر اُس سے سوال کرے) رات کو کیوں آیا؟

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

داروغہ: (ہاتھ جوڑ کر) ایک الم ناک داستان سنانے کو۔

اکبر: (اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر) بیان کر!

داروغہ: (ہانپتے ہوئے) صاحب عالم نے اس وقت بہ زورِ شمشیر انارکلی کو زنداں سے نکال لے جانا چاہا۔

اکبر: (پاگلوں کی طرح داروغہ کا منھ تکتے ہوئے) کیا؟

داروغہ: وہ تلوار سونت کر میرے سرہانے پہنچے۔ شمشیر کی نوک میرے سینے پر رکھ مجھ سے کنجیاں چھین لیں اور زنداں میں داخل ہو گئے۔

اکبر: (کھڑا ہو جاتا ہے) شیخو! بہ زورِ شمشیر! (تحیّر کے عالم میں ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں) باپ کو برباد کر چکنے کے بعد اب وہ شہنشاہ سے بھی باغی ہے۔ (توقف کے بعد کوشش کر کے سکون سے) اور کیا ہوا؟

داروغہ: میں صاحب عالم سے مقابلہ کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ دروازے کے پاس کھڑا ہو کر ان کی گفتگو سننے لگا۔

اکبر: (دوسری طرف منھ کر کے) وہ کیا باتیں کر رہے تھے؟

داروغہ: (تھوڑے سے توقف کے بعد ڈرتے ہوئے) انھیں سُن کر شہنشاہ کی سماعت کو صدمہ پہنچے گا۔

اکبر: (گرج کر) بول!

داروغہ: شہزادہ چاہتا تھا انارکلی کو لے کر بھاگ جائے لیکن انارکلی ہندستان چاہتی تھی۔ وہ بولی یہ زنجیریں نہ کاٹو، اور زنجیریں پڑ جائیں گی۔ میرے اور تمھارے درمیان جو دیوار کھڑی ہے اُس کو ڈھاؤ۔

اکبر: (سامنے گھورتے ہوئے) دیوار! ذرا دیر بعد اس کا سر یوں جھک جاتا ہے، گویا گردن پر ڈھیلا ڈھیلا ہے)

داروغہ: (اکبر کو متاثر دیکھ کر) صاحب عالم نے انکار کر دیا اور بھاگ چلنے پر زور دیا۔

اکبر: (یک لخت داروغہ کا گریبان پکڑ کر) تو جھوٹ بولتا ہے۔ اُس نے انارکلی کی آرزو پوری کرنے کا وعدہ کیا۔

داروغہ: (ذرا دیر سمجھ نہیں سکا، کیا کہے۔ آخر سراسیمگی سے) نہیں۔ ہاں۔ وہ مجبور کر دیے گئے تھے۔

اکبر: (داروغہ کا گریبان چھوڑ کر قہر آلود نگاہیں اس پر گاڑ دیتا ہے) اور پھر؟

داروغہ: دونوں نے وہاں سے نکلنا چاہا۔

اکبر: اور تو؟

داروغہ: میں نے مقابلہ کر کے صاحب عالم کو روکنا محال جانا۔ میں نہ تلوار نکال سکتا تھا نہ انھیں زنداں میں بند کر دینے کی جرأت کر سکتا تھا۔ میں دوڑا ہوا اندر گیا اور میں نے کہا ظلِ الٰہی ادھر تشریف لا رہے ہیں۔

اکبر: اور وہ کیا بولے؟

داروغہ: انارکلی بولی صاحب عالم تلوار کھینچو اور صاحب عالم نے کہا شہنشاہ کو آنے دو۔

(اکبر اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر نہیں سنبھل سکا۔ اوندھا گرنے لگتا ہے۔ داروغہ بڑھ کر اُسے تھام لیتا اور تخت پر بٹھا دیتا ہے۔ اکبر ذرا دیر بعد نظر اس کی طرف اٹھاتا ہے)

داروغہ: (توقف کے بعد) میں نے انھیں اس کوشش کے انجام سے ڈرایا اور وعدہ کیا کہ ظلِ الٰہی کے چلے جانے کے بعد میں خود

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

انارکلی کے فرار میں امداد دوں گا۔ شہزادے کو یقین نہ آتا تھا لیکن جب میں نے اس کام کے لیے رشوت طلب کی تو انھوں نے مان لیا مگر ساتھ ہی دھمکی دی کہ وعدہ خلافی کی صورت میں ظلِ الٰہی کے حضور میں جھوٹی شہادت پہنچائی جائے گی کہ تو نے رشوت لی ہے۔

اکبر: (کمزور آواز میں) وہی دھمکی جو دل آرام کو دی گئی تھی۔

داروغہ: اس کے بعد میں انھیں اپنے حجرے میں لے گیا اور وہاں اُن کو بند کر کے اطلاع دینے کے لیے بارگاہِ عالی میں حاضر ہوا۔

اکبر: (منھ ہی منھ میں) یوں ہی ہونا تھا۔ یوں ہی ہونا تھا۔

داروغہ: (لجاجت سے) صاحبِ عالم معصوم ہیں۔ ترغیب خوف ناک تھی۔

اکبر: (سوچتے ہوئے پُرمعنی انداز میں) ہاں ترغیب خوف ناک ہے۔

داروغہ: مجھے اندیشہ ہے، صاحبِ عالم کل کوئی اور فتنہ نہ کھڑا کریں۔

(اکبر کچھ جواب نہیں دیتا۔ ساکت و جامد بیٹھا ہوا ہے۔ توقف غیر محدود معلوم ہوتا ہے)

میں ظلِ الٰہی کے فرمان کا منتظر ہوں۔

اکبر: (کچھ دیر بعد سکون سے) موت!

داروغہ: (آہستہ سے) کس کی؟

اکبر: (جوش سے بے تاب ہوکر) جس کے رقص نے ہندستان کے تختِ سلطنت کو لرزا دیا۔ جس کے نغمے نے ایوانِ شاہی میں شعلے بھڑکا دیے۔ جس کے حُسن نے جگر گوشۂ مغلیہ کے حواس چھین لیے۔ جس کی نظروں نے ہندستان کے شہنشاہ کو، شیخو کے باپ کو، جلال الدین کو لوٹ لیا۔ جس کی ترغیب نے خون میں خون کے خلاف زہر ملایا۔ جس کی سرگوشیوں نے قوانینِ فطرت کو بدلنا چاہا۔ لٹا ہوا باپ، تھکا ہوا شہنشاہ، ہارا ہوا فاتح، اُسے فنا کرے گا، مارے گا، مٹائے گا۔ جس طرح اس نے میری اولاد کو مجھ سے جدا کیا، یوں ہی وہ اپنی ماں سے جدا ہوگی۔ جس طرح اس نے مجھے عذاب میں ڈالا، یوں ہی وہ عذاب میں مبتلا کی جائے گی۔ جس طرح اس نے میرے ارمانوں اور خوابوں کو کچلا، یوں ہی اُس کا جسم کچلا جائے گا۔ لے جاؤ۔ اکبر کا حکم ہے۔ سلیم کے باپ کا، ہندستان کے شہنشاہ کا۔ لے جاؤ اس حسین فتنے کو، اس دل فریب قیامت کو، لے جاؤ۔ گاڑ دو۔ زندہ دیوار میں گاڑ دو! زندہ دیوار میں گاڑ دو!

(داروغہ رخصت ہو جاتا ہے۔ اکبر بولتا بولتا کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا جوش جیسے اُس کے قابو سے نکل گیا تھا۔ تھک کر نیم بے ہوشی کی حالت میں مسند پر گر پڑتا ہے)

لفظ و معنی

ولی عہد	-	بادشاہِ وقت کا ہونے والا جانشین
بے تکلف	-	بناوٹ کے بغیر، سیدھا سادا، بے ساختہ
حرم	-	منکوحہ بیوی، کنیز، شرفا کا زنان خانہ

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

حرم سرا	-	زنان خانہ، بیگموں حرموں کے رہنے کا مکان
منظورِ نظر	-	نظر کو پسند، پیارا، محبوب
خواجہ سرا	-	زنانہ مکان میں خدمت کرنے والا، ہیجڑا غلام ۔
داروغۂ زنداں	-	قید خانے کا ذمے دار افسر
خواب گاہ	-	سونے کی جگہ، سونے کا کمرہ
تکلف	-	بناوٹ، تصنع، تکلیف اٹھا کر کوئی کام کرنا
آراستہ	-	سجایا ہوا، سنوارا ہوا
حُجرہ	-	خلوت خانہ، چھوٹا کمرہ
ماہی پشت چھت	-	مچھلی کی پیٹھ جیسی چھت
قِرمزی	-	سرخ، لال
خوش وضع	-	اچھی بناوٹ کا
جھروکا	-	دریچہ، وہ کھڑکیاں جو ایوانِ شاہی میں سیر تماشا دیکھنے کے واسطے باغ یا دریا کی طرف واقع ہوتی ہیں۔
جڑاو	-	جواہرات سے جڑا ہوا
ہشت پہلو	-	آٹھ پہلوؤں والا
دوشاخہ	-	مجرم کی گردن پھانسنے کا شکنجہ
رتن مالا	-	ایک قسم کا پھول، ہیروں کا ہار
کرن پھول	-	ایک طرح کا پھول، کان کا ایک زیور
عطر بیز	-	خوشبودار، مہکتا ہوا
فرغل	-	روئی دار لبادہ
چکنا چور کرنا	-	ٹکڑے ٹکڑے کر دینا، برباد کر دینا
توقع	-	امید، بھروسا، آس
جَل کر	-	ناراض ہو کر، غصّے میں
ضبط	-	برداشت، تحمل
عشوہ	-	ناز نخرا
ارزاں	-	سستا، کم قیمت
کنیز	-	دائی، لونڈی، ماما
قلق	-	افسوس، پچھتاوا، رنج

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

چڑھا ہوا دریا	–	دریا میں پانی کا زیادہ ہونا، وقتی طور پر بہت زیادہ جذباتی ہونا
ممنونِ احسان	–	احسان مند، شکر گزار
ظلِ الٰہی	–	خدا کا سایہ، بادشاہ
والی	–	مالک، حاکم، سرپرست
ٹیس	–	زخم میں ہونے والا درد
دنیا سے سیر ہونا	–	دنیا سے دل بھر جانا، دنیا سے بے زار ہونا
ناشاد	–	دُکھی، رنجیدہ، ملول
جم کر رہ جانا	–	منجمد ہو کر رہ جانا، چپک جانا
ہاتھ پھیلانا	–	دستِ سوال دراز کرنا، مانگنے کے واسطے ہاتھ پھیلانا
التجا کرنا	–	منت سماجت کرنا، گزارش کرنا
ہوش حواس کھو بیٹھنا	–	عقل گم ہونا، بے ادوسان ہونا
حواس	–	ہوش، ادوسان
نامراد	–	محروم، ناکام، بے مزاد
دَم توڑ دینا	–	مر جانا
منصف	–	انصاف کرنے والا
توقف	–	دیر، وقفہ
دردانگیز	–	درد پیدا کرنے والا
مرحلہ	–	منزل
جہاں بانی	–	بادشاہت
ملول	–	رنجیدہ، غم گین، اداس
انداز دکھانا	–	ادا دکھانا، چھب دکھانا
اشارے کنایے کرنا	–	آنکھ یا ہاتھوں یا کسی اور عضو کے وسیلہ سے دل کی بات ظاہر کرنا، بغیر بولے اپنا منشا ظاہر کرنا، بہکانا
الٹے پانو واپس ہونا	–	فوراً واپس ہونا
مُجرا بجالانا	–	ادب کے ساتھ جھک کر سلام کرنا
سراسیمگی	–	پریشانی، حیرانی
دوزانو ہونا	–	گھٹنوں کے بَل ہونا، ادب سے بیٹھنا
لجاجت	–	خوشامد

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

• حضور میں ہونا	–	روبرو ہونا، دربار، اجلاس
عتاب	–	غضب، قہر، غصہ
افشائے راز	–	بھید ظاہر ہونا، پردہ فاش ہونا
ہول ناک	–	بھیانک، ڈراونا، خوف ناک
سایۂ عاطفت	–	مہربانی اور شفقت کا سایہ
تامّل	–	تذبذب، ہچکچاہٹ، فکر
آنچ آنا	–	مصیبت آنا، صدمہ پہنچنا
کھوجانا	–	محو ہوجانا، گم ہوجانا
ایذا	–	تکلیف، دکھ
تاب	–	برداشت، طاقت
بارگاہ	–	شاہی محل
عالی	–	اونچا، بلند، عظیم، قابلِ تعظیم
شہادت	–	گواہی
سُن ہوجانا	–	سکتے کی حالت میں ہونا، چپ رہ جانا
تہی دست	–	خالی ہاتھ
شَرَف	–	عزّت، فخر، بزرگی
شرفِ باریابی	–	خدمت میں حاضر ہونے کی عزّت، حاضر ہونے یا ملاقات کا شرف
تضحیک	–	مذاق اڑانا، کسی پر ہنسنا
سماعت	–	سننے کی طاقت
صدمہ پہنچانا	–	تکلیف یا نقصان پہنچانا
بے تاب	–	بے چین، بے قرار
آنکھوں سے چنگاریاں نکلنا	–	نہایت غضب ناک ہونا
دماغ میں شعلے بھڑکنا	–	نہایت غضب ناک ہونا، نہایت غصہ ہونا
مہیب	–	ڈراونا، خوف ناک، بھیانک
الم ناک	–	سخت تکلیف دہ، دردناک
تلوار سونتنا	–	تلوار کھینچنا، قتل کا ارادہ کرنا
تحیّر	–	حیرت، تعجب، اچنبھا

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

ماتھے پر بل پڑنا	–	چہرے سے رنج ظاہر ہونا، غصہ آنا
باغی	–	بغاوت کرنے والا، نافرمان
یک لخت	–	اچانک، فوراً
قہر آلود	–	جس میں قہر شامل ہو، غصے سے بھرا ہوا
نگاہیں گاڑنا	–	نگاہیں جمانا، کسی چیز کو غور سے دیکھنا
محال	–	ناممکن
مہابلی	–	بڑا طاقت ور، نہایت زبردست، شہ زور
معصوم	–	بے گناہ
ترغیب	–	رغبت دلانا، اُکسانا، بہکاوا
اندیشہ	–	خدشہ، تردّد، فکرمندی، سوچ
فتنہ کھڑا کرنا	–	ہنگامہ برپا کرنا، ہل چل مچانا، غدر مچانا
ساکت	–	بے حرکت، خاموش، دم بہ خود
جامد	–	جما ہوا، ٹھوس
غیر محدود	–	جس کی کوئی حد نہ ہو
لرزانا	–	ڈرانا، خوف دلانا
ایوانِ شاہی	–	شاہی محل
جگر گوشہ	–	اولاد
لوٹ لینا	–	تباہ و برباد کر دینا
سرگوشی	–	کانا پھوسی
قوانین	–	قانون کی جمع
فطرت	–	قدرت، خلقت
فنا کرنا	–	برباد کرنا
دل فریب	–	دل کو لبھانے والا، من موہن
فتنہ	–	جھگڑا، فساد، بغاوت

آپ نے پڑھا

❑ ڈرامانثر کے ساتھ نظم کے پیرایے میں بھی لکھا گیا ہے۔ عہدِ قدیم میں تو اکثر و بیش تر ڈرامے منظوم ہوتے تھے۔ افسانہ اور ناول کی طرح قصّے کو اس میں مرکزی مقام حاصل ہے، اس فرق کے ساتھ کہ اس کے عناصر

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

فکشن کی دوسری اصناف سے بعض معاملوں میں جدا ہوتے ہیں۔ ڈراما یونانی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی کر کے دکھانا ہے۔ اس معنی کے پیش نظر اس کا تعلق مظاہرہ یا اسٹیج سے ہو جاتا ہے۔ اس کا التزام ہر زبان کے ڈراما نگار کو کرنا ہوتا ہے۔ اسی لیے ڈراما نگار محض لکھتا نہیں ہے بلکہ یہ امر بھی اس کے پیش نظر ہوتا ہے کہ اسی کو ناظرین کو دکھانا ہے۔ کردار یا کرداروں کی خود کلامی سے لے کر ان کے مکالموں کو بھی ناظرین کو سنانا اس کے مقاصد میں شامل ہے۔ محض سنانے یا پڑھنے کے لیے لکھے گئے ڈرامے اکثر کامیاب نہیں تصور کیے گئے۔

- ڈرامے کا ایک اور امتیازی عنصر کش مکش اور تصادم ہے۔ قصے کے تار و پود میں پیوست یہ عناصر کسی ڈرامے کی اصل اور اساس ہیں۔ اس سے ڈراما نگار اسٹیج پر رونما ہونے والے واقعات، کرداروں کی حرکات و سکنات اور ان کے مکالموں سے ڈرامائیت پیدا کرتا ہے۔ اور اس طرح قصے کے کلائمکس یا انجام کے تئیں ناظرین کے دلوں میں اشتیاق، تجسس اور دل چسپی کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اسی مرحلے میں کرداروں کے باہمی ٹکراؤ کو بھی اسٹیج پر پیش کرنا لازمی ہوتا ہے جس سے ناظرین کی دل چسپی اور قصے میں شراکت عروج تک پہنچتی ہے۔ اس لیے تصادم ڈرامے کا ایسا لازمی عنصر ہے جس کے بغیر کوئی ڈراما اپنے طربیہ یا المیہ انجام تک نہیں پہنچ سکتا۔ انارکلی تو مختلف طرح کے تصادمات کی آماج گاہ تسلیم کی جاتی ہے۔
- ڈرامے میں کش مکش، نظریات و اقدار اور ذہنی رویّوں کے مابین تصادم سے پیدا ہوتی ہے۔ نئے اور پرانے، اچھے اور بُرے، خوش گوار یا ناگوار، صورتِ حال کے مابین تصادم اور انجام کار؛ ان میں سے کسی ایک کا غلبہ یا شکست و فتح یا کامرانی۔
- امتیاز علی تاج کا ڈراما انارکلی، نہ صرف ان کی تمام تصانیف میں سب سے ممتاز ہے، بلکہ اردو کے مقبول ترین ڈراموں میں سرِ فہرست بھی ہے۔ تاج نے انارکلی کا قصہ تاریخ سے اخذ کیا ہے جس کی تاریخی حیثیت کو مشکوک ہے مگر اس میں شامل عوامی روایت کا عنصر اس قدر قوی ہے کہ پورا قصہ سچا معلوم ہوتا ہے۔
- انارکلی کے قصے کا تعلق مغل شہنشاہ کے حرم سرا سے ہے۔ شہنشاہ اکبر کا ولی عہد شاہزادہ سلیم حرم سرا کی ایک کنیز انارکلی پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ ایک کنیز سے اپنے لختِ جگر کی محبت کو اکبر قبول نہیں کر پاتا اور آخر وہ دونوں محبت کرنے والے اس کے عتاب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ انارکلی دیواروں کے بیچ زندہ چُن دی جاتی ہے اور سلیم قید کر لیا جاتا ہے۔
- عشق، رقص اور موت کی سرخیوں کے تحت امتیاز علی تاج نے ڈراما ''انارکلی'' کو تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ اوّلین دو ابواب چار چار اور آخری باب پانچ مناظر پر مشتمل ہے۔ ہر منظر کا ایک ذیلی عنوان بھی ہے۔ نصاب میں شامل حصّہ تیسرے باب کا منظرِ سوم ہے۔
- یہ ڈرامے کا سب سے اہم اور مؤثر حصّہ ہے۔ یہاں اکبرِ اعظم شدید جذباتی صدموں کا سامنا کرتے ہوئے انارکلی کی موت کا فرمان جاری کرتا ہے۔ جس کش مکش کو ڈرامے کے گذشتہ مناظر میں برقرار رکھا گیا تھا،

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

یہ حصہ اس کا نقطۂ عروج پیش کرتا ہے۔

❑ ڈراما 'انارکلی' قصے کے انجام کے اعتبار سے ایک المیہ ہے۔ اس کے بیش تر کردار الم ناک تجربے کا سامنا کرتے ہیں۔ ناکامی اور شکست سے یہ بھی دوچار ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ ناکام اور شکست خوردہ کردار اصل میں اکبر ہی ہے۔

آپ بتائیے

1- ڈراما "انارکلی" کے خالق کا نام کیا ہے؟
2- امتیاز علی تاج کے علاوہ پانچ دیگر ڈراما نگاروں کے نام لکھیں؟
3- شہزادہ سلیم کے والد کا اصل نام کیا تھا؟
4- دل آرام کون تھی؟
5- کس نے کہا، "انارکلی کا ہو کر وہ ہمارا سلیم بن جائے گا؟"
6- انارکلی کا اصل نام کیا تھا؟
7- انارکلی کی بہن کا نام کیا تھا؟
8- انارکلی کی پہلی اشاعت کب ہوئی؟
9- انارکلی کے تین اہم کرداروں کے نام بتائیے۔
10- "فاتح ہند کی قسمت میں ایک کنیز سے شکست کھانا لکھا تھا"، کیا یہ بات سلیم نے کہی؟
11- "میں خوش ہوں کہ میں صرف ماں ہوں اور مجھ کو رنج ہے کہ آپ شہنشاہ ہیں، صرف شہنشاہ"۔ کیا یہ بات انارکلی کی ماں نے اکبر سے کہی؟
12- "باپ کو برباد کرنے کے بعد اب وہ شہنشاہ سے بھی باغی ہے۔" اکبر نے یہ بات کس کے بارے میں کہی؟
13- سلیم کے لیے اکبر کا کیا خواب تھا؟

❑ دیے گئے الفاظ کی ضد بتائیے۔

ویران	موت	سستا	فتح	ارزاں
سختی	حق	گناہ	مشکل	جہنم

مختصر گفتگو

1- دل آرام، انارکلی کو کیوں ناپسند کرتی تھی؟
2- اکبر اپنی خواب گاہ میں حد درجہ پریشان کیوں نظر آتا ہے؟

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)

3- رانی نے اکبر کو سمجھانے کے لیے کیا باتیں کہیں؟
4- انارکلی کی ماں سے اکبر کیا سلوک کرتا ہے؟

تفصیلی گفتگو

1- اکبر کے کردار سے اپنی واقفیت ظاہر کیجیے۔
2- انارکلی کا شاملِ نصاب حصہ آپ کو کیسا لگا؟ اس کے متعلق اظہار کیجیے۔
3- سلیم کی ماں اور انارکلی کی ماں میں کیا فرق ہے؟
4- یہ ڈراما کس کردار کا المیہ ہے؟ بحث کریں۔
5- تصادم کیا ہے؟ کیا آپ اس ڈرامے میں بعض تصادمات کی نشان دہی کر سکتے ہیں؟
6- شاہزادہ سلیم اور انارکلی کی محبت کا انجام لکھیے؟
7- دل آرام نے اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے کیا کیا؟

آیئے، کچھ کریں

1- شہنشاہ اکبر اور شہزادہ سلیم کی تصویر لائبریری میں موجود کسی کتاب سے تلاش کر کے اس کی نقل تیار کیجیے؟
2- اکبر کی خواب گاہ میں جن اشیا کو دکھایا گیا ہے، ان کی ایک فہرست تیار کریں۔
3- اکبر کی ذہنی کیفیت کا پتا دینے والے وہ فقرے جنھیں ڈراما نگار نے مکالموں کی ابتدا، وسط یا آخر میں قوسین کے اندر درج کیے ہیں، ان کی فہرست (بالترتیب) تیار کیجیے؟
4- اسی طرح شاملِ نصاب حصے میں پیش کیے گئے دوسرے کرداروں کی حرکات و سکنات کی فہرست تیار کی جا سکتی ہے، اور ان کے مرتبے اور حیثیت کا پتا لگایا جا سکتا ہے۔
5- اسٹیج کی آرائش اور کرداروں کی زیبائش کو ملحوظ رکھتے ہوئے، ڈرامے کا شاملِ نصاب حصہ ڈرامے کی شکل میں اسکول کے کسی پروگرام میں پیش کیجیے؟

© copyright reserved to BSTBPC, Government of BIHAR (www.bstbpc.gov.in).
Publishing web/app/books will be a crime. Published by Abdiel Solutions (www.absol.in)